بندوں کو رب سے جوڑنے والی تحریریں

بندگی کے رنگ میں رنگ دینے والے مضامین

www.Inzaar.pk

ابویحییٰ

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

Financial Assistance

Please join hands with Inzaar in spreading the message of Almighty Allah – faith & morality (ایمان و اخلاق) , personality development (تعمیرِ شخصیت) and the success in life hereafter (فلاحِ آخرت).

You can support us financially by sending your donations.

Bank Account Details

For Local Transaction

Title of Account: Inzaar Educational and Charitable Trust

Address: P.O.BOX.7285 Karachi.

Account Number: 0080248866323

Branch Code: 0080

Bank Name: United Bank Limited

Branch Address: UBL Vault Branch, Abdullah Haroon Road, Saddar, Karachi.

For Foreign Transaction

IBAN: PK32 UNIL 0109 0002 4886 6323

SWIFT CODE: UNILPKKA

Please do send us the details of donation at 0092-345-8206011 or ghazialamgir1@gmail.com after transfer of funds for acknowledgement / issuance of receipts.

بندگی کے سو رنگ

بندوں کو رب سے جوڑنے والی تحریریں

بندگی کے رنگ میں رنگ دینے والے مضامین

ابو یحییٰ

انذار پبلیشرز

A Non-Profit Organization

www.inzaar.pk

نام کتاب : بندگی کے سو رنگ

ISBN نمبر :

مصنف : ابویحییٰ

ناشر : انذار پبلیشرز: 03323051201

ویب سائٹ : www.inzaar.org

ای میل : abuyahya267@gmail.com

ٹائٹل : حافظ حسن سلیم

قیمت : 350 روپے

ملنے کا پتہ : پوری دنیا میں کسی بھی جگہ گھر بیٹھے یہ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے۔

(0092)-03323051201

مزید مقامات کے لیے دیکھیے ہماری

ویب سائٹ www.Inzaar.org

اللہ کی بندگی کے رنگ میں رنگ جاؤ
اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہے؟

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بندگی کے سو رنگ

انسان خدا کا بندہ ہے، مگر اِس دنیا میں بندہ بن کر رہنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی انسان کا اصل المیہ ہے۔ قرآن مجید اِسی انسانی المیے پر متوجہ کرنے والی آسمانی کتاب ہے۔ مگر بدقسمتی سے لوگ قرآن کو پڑھتے نہیں، پڑھتے ہیں تو سمجھتے نہیں، سمجھتے ہیں تو اپنی پسند کے نتائج اخذ کرنے کے لیے۔ حالانکہ قرآن آخری درجہ میں واضح ہے کہ اس کا پیغام بندوں کا بندہ بن کر رہنے کا درس دینا ہے۔ یہی مقصد تخلیق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''میں نے جن وانس کو اپنی بندگی ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔''، (الذاریات 56:51)

بندگی کی یہ دعوت اپنے اندر اتنے ہی رنگ لیے ہوئے ہے جتنے خود زندگی کے مختلف رنگ، پہلو اور گوشے ہیں۔ پیش نظر کتاب میں زندگی کے ان رنگوں کو بندگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس مجموعہ مضامین کا نام ''بندگی کے سو رنگ'' رکھا گیا ہے۔

کتاب کا ہر مضمون وہ زاویہ نظر دیتا ہے جو ایک بندہ مومن سے اس کے مالک کو مطلوب ہے۔ چاہے اس کا تعلق زندگی کے فکری پہلو سے ہو یا عملی پہلو سے۔ بندگی کی سوچ مومن کی فکر وعمل کے ہر رنگ کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ بندے کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر رنگ کو مالک کے بنائے ہوئے کینوس (canvas) کے پس منظر میں دیکھے۔

اس طالب علم کو یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد آپ کی زندگی بندگی کے رنگوں میں انشاءاللہ رنگ جائے گی۔ یہی اس کتاب کا مقصد تصنیف ہے۔

ابو یحییٰ

مجھے ان سے محبت ہوگئی ہے

انسان ایک قاتل کائنات کا باسی ہے۔ کرہ ارض کو چاروں طرف سے جس قسم کی کائنات نے گھیر رکھا ہے وہ دہشتناک اور مہیب خلا، دہکتے ہوئے ستاروں، بے آب و گیاہ سیاروں، سرد و تاریک چٹانوں کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں۔ خود اس زمین کا بیشتر حصہ ناقابل برداشت ریگزاروں اور گلیشیئرز، سمندروں اور بنجر وادیوں سے عبارت ہے۔ ان میں سے ہر چیز انسان کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔

تاہم ایک کریم و مہربان ہستی کی نظر عنایت ہوتی ہے اور یہی قاتل کائنات زندگی کے نغمے گنگنانے لگتی ہے۔ آگ کے گولے جگمگاتے ستارے بن جاتے ہیں۔ دہکتا ہوا سورج روشن چراغ بن جاتا ہے۔ بھیانک خلا دلکش فضا میں بدل جاتا ہے۔ سمندروں کا کھارا پانی دریا اور پہاڑوں کے میٹھے پانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بنجر زمین سبزہ زاروں کا روپ دھار لیتی ہے اور ناقابل برداشت موسم متوازن اور معتدل موسم میں ڈھل جاتا ہے۔

ایک قاتل کائنات کو مہربان بنانے والی ہستی اپنی ذات میں کتنی مہربان ہوگی، اس کا حقیقی اظہار تو اسی وقت ہوگا جب جنت کی زندگی میں اس کے پسندیدہ بندے اس کے روبرو پیش کیے جائیں گے......اس کی عنایتیں چارسوان کا احاطہ کرلیں گی۔ ان کی زندگی ہر غم والم اور ہر دکھ اور پچھتاوے سے خالی کر دی جائے گی۔ مگر آج بھی وہ لوگ جو شعور کی آنکھ کھلی رکھتے ہیں اور غفلت کی پٹی باندھ کر نہیں جیتے، اس قاتل کائنات میں اپنی موت کے سامان کے درمیان اسباب زندگی کو یوں بکھرا ہوا دیکھ کر اس کریم کی محبت سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ وہ بے اختیار کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میری ہستی عبادت ہوگئی ہے

مجھے ان سے محبت ہوگئی ہے

ماچس

اس دنیا میں ہوا اور پانی کی طرح آگ بھی انسانوں کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ اپنے جسم کو گرم رکھنے سے لے کر کھانا پکانے اور روشنی کے حصول جیسی اہم ترین ضروریات اسی آگ پر منحصر ہیں۔ زمانہ قدیم ہی سے سورج اس آگ کا بنیادی ذریعہ تھا۔ دوسرا ذریعہ جنگلات تھے جن میں بجلی گرنے یا دیگر وجوہات سے لگنے والی آگ نے انسانوں کو یہ احساس دلایا کہ سورج پر تو قابو پانا ممکن نہیں کیوں نہ آگ پر قابو پالیا جائے۔

انسان نے چقماق (Flint) کے ذریعے سے پہلی دفعہ آگ کو اپنے قابو میں کیا۔ لیکن یہ طریقہ انتہائی مشکل اور صبر آزما تھا۔ انسان نے صدیوں تک اس مسئلے کو حل کرنا چاہا یہاں تک کہ دور جدید میں سلفر کے عنصر کی جلنے کی خصوصیت کی دریافت کے بعد آخر کار ماچس یا دیا سلائی انیسویں صدی میں ایجاد ہوئی۔ اس میں آگ کو محفوظ طریقے پر اور انتہائی سستے داموں انسانوں کے لیے قابلِ حصول بنا دیا گیا۔ آگ جلا کر روشنی اور حرارت حاصل کرنا جو اس سے پہلے ایک خطرناک اور جوکھم کا کام تھا بچوں کا کھیل بن گیا۔

آج ہم جب صبح وشام ماچس اور لائٹر کے ذریعے بہت آسانی سے آگ حاصل کر کے چولہا اور گیزر وغیرہ جلاتے ہیں تو ہزاروں برس پر پھیلی یہ تاریخ ہمارے ذہن میں نہیں ہوتی۔ مگر درحقیقت یہ سادہ ایجاد ان ہزاروں عنایات میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ نے دور جدید کے انسانوں پر کی ہیں اور جن کی وجہ سے ہماری زندگی بہت آسان ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دور جدید کے انسان کے پاس اس کا سب سے بڑھ کر موقع ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ماضی سے کہیں بڑھ کر سراہے۔ اس کی حمد وتعریف کرے۔ اس کی محبت کے نغمے گائے۔ مگر آج کا انسان ہی وہ ہستی ہے جو سب سے بڑھ کر خدا کو بھولا ہوا اور اس کی ناشکری میں مصروف ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ جدید انسان کا المیہ۔

اپنے اعمال آج تولیے

''آج میں آپ کوایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں۔''

عارف نے مجلس کے آغاز میں جب یہ بات کہی تو ہر سننے والا ہمہ تن گوش ہو گیا۔ گرچہ اس سے قبل بھی ان کی پوری توجہ عارف ہی کی طرف تھی۔ وہ ایک وقفے کے بعد دھیرے سے بولے:

''آج میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اِسی دنیا میں رہتے ہوئے آپ جان سکتے ہیں کہ روزِ قیامت میزان میں آپ کا نیکی کا پلڑا بھاری ہو گا یا گناہوں کا۔''

یہ کہہ کر وہ دوبارہ ٹھہر گئے۔ اس وقفے کا فائدہ اٹھا کر ایک صاحب گویا ہوئے:

''جس کے نیک عمل گناہوں سے زیادہ ہوں گے اسی کی میزان بھاری ہو گی۔ کیا اس کے علاوہ بھی اعمال تولنے کا کوئی طریقہ ہے؟''

''آپ نے درست کہا۔ مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ وہاں اعمال کی گنتی ہی نہیں ہو گی بلکہ ان کی تول بھی ہو گی۔ پہلے مرحلے میں نامہ اعمال پیش ہو گا۔ اس میں ہر عمل لکھا ہوا ہو گا۔ مگر میزان کا معاملہ جدا ہے۔ میزان میں تو ان اعمال کا وزن ہو گا۔ اسی وزن پر انسان کی نجات، بلندی درجات یا پکڑ کا حتمی فیصلہ ہو گا۔''

عارف یہ کہہ کر رکے تو ہر چہرے پر ایک سوال پیدا ہو چکا تھا۔ عارف دوبارہ بولے:

''میں یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ جیسے نیک لوگ اپنے نیک اعمال کی کثرت کے باوجود قیامت کے دن کہیں محرومی کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس لیے اللہ کی تول سے قبل آج ہی اپنی تول کر لیں۔''

یہ کہہ کر عارف پھر رکے تو ان کے قریب بیٹھے ایک شخص نے ذرا گھبرائے ہوئے انداز میں

کہا۔

''جناب! آج تو آپ بہت ڈرا رہے ہیں۔''

''ہاں! مگر یہ علم ضروری ہے۔ یہ علم نجات کے لیے بھی ضروری ہے اور بلندی درجات کے لیے بھی ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن، خدا نہ کرے ہم کسی محرومی کا شکار ہو جائیں۔''

یہ کہہ کر عارف نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حاضرین پر نظر ڈالی۔ لوگ بالکل خاموشی سے ان کی طرف متوجہ تھے۔ وہ بولے:

''ہم اس لیے محروم رہ جائیں گے کہ روزِ قیامت ہمارے نامہ اعمال میں ہر نیکی ہوگی۔ نماز، حج، روزہ، زکوٰۃ۔ مگر ہمارے پاس ان اعمال کی روح نہیں ہوگی۔ چنانچہ روز قیامت جب ہمارے بہت سارے اعمال کو میزان میں رکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ان کا وزن تو بہت کم ہے۔ دوسری طرف ہمارے گناہوں کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہوگا۔ یہ گناہ ہماری تول میں برائی کے پلڑے کو بھاری کرنے کا سبب بن جائیں گے۔''

''مگر گناہ تو تھے ہی نہیں۔ ہم نے زنا نہیں کیا۔ قتل نہیں کیا۔ زمین میں فساد نہیں کیا۔''

ایک صاحب نے کچھ احتجاجی لہجے میں گفتگو میں مداخلت کی۔

''گناہ کی شکل نہیں تھی۔ مگر اسپرٹ پوری طرح موجود تھی۔''

یہ جواب دیتے ہوئے عارف کا لہجہ ایک دم سے سخت ہو گیا۔

''ہم نے جسمانی طور پر کسی عورت سے زنا نہیں کیا۔ مگر ہم میں سے کتنے ہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دل اور نگاہ سے کتنی ہی اداکاراؤں، ماڈلوں اور اردگرد پائی جانے والی خواتین کے ساتھ بار بار بدکاری کی۔ حتیٰ کہ بڑھاپے میں بھی ہم یہ جرم کرتے رہے۔''

عارف کی یہ بات سنتے ہوئے کتنے ہی لوگوں نے سر نیچے جھکا لیا۔ عارف نے لوگوں کے

ردعمل سے بے نیاز اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔

’’ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ مگر کتنے قاتلوں کو اپنے سیاسی تعصّبات کی بنیاد پر ووٹ دیے۔ کتنے قاتلوں کو اپنے فرقہ وارانہ اور نظریاتی تعصّبات کی بنیاد پر ہیرو اور شہید کہہ کران کی حمایت کرتے رہے۔ ہماری حمایت اور تحفظ کی بنا پر یہ قاتل مضبوط ہوئے۔ جس کے بعد روز قیامت قاتلوں کے ہر جرم کا ایک حصہ ہمارے نامہ اعمال میں بھی ڈال دیا جائے گا۔‘‘

عارف کی یہ بات بھی تلوار کی کاٹ کی طرح دلوں کو چیرتی چلی گئی۔ یہ ایک ایسی سچائی کا بیان تھی جو بہت سے لوگوں پر صادق آتی تھی۔ وہ بغیر رکے بولتے رہے۔

’’ہم نے زمین پر فساد نہیں مچایا۔ مگر ہم نے کم تولا، زیادہ لیا۔ یہ فساد فی الارض ہے۔ ہم نے اپنی انانیت اور مفادات کی بنا پر ان لوگوں کا ساتھ نہیں دیا جو حق کے علمبردار تھے۔ یہ فساد فی الارض ہے۔ ہم نے ہر سنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے پھیلا کر دوسروں کی جان، مال، آبرو خطرے میں ڈالی۔ یہ فساد فی الارض ہے۔‘‘

عارف کے لہجے میں غضب تھا۔ ان کی آواز میں گرج تھی۔ ان کا یہ انداز کم ہی لوگوں کے سامنے آیا تھا۔ لوگوں کے چہروں کے تاثرات ایک آئینے کی طرح یہ بتا رہے تھے کہ آج وہ ایک طوفان کا سامنا کر رہے ہیں۔ عارف کو بھی اپنے لب ولہجہ کی سختی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے قدرے نرمی سے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا:

’’سو ہماری میزان میں ہر بڑے گناہ کی شکل نہ سہی روح ضرور ہوگی۔ اور روز قیامت وزن اعمال کی روح جاننے کے لیے ہی کیا جائے گا۔ اب جب آپ کو اپنے اعمال کا وزن معلوم ہو چکا ہے تو ضمیر کی میزان پر خود کو تول لیجیے۔ قبل اس کے کہ خدا اپنی میزان پر ہمیں تولے۔‘‘

عاف کی بات ختم ہو گئی مگر ہر اس شخص کو لرزا گئی جس کے سینے میں پتھر نہیں دل تھا۔

دنیا کو مطلوب

اللہ کا مطلوب انسان کیا ہے؟ یہ انسان خدا کی محبت سے آخری درجہ میں سرشار ہوتا ہے۔ یہ اس کی حمد کے نغمے بکھیرتا اوراس کی عظمت کے ترانے پڑھتا ہے۔اسے اگر میرے آقا داؤد علیہ السلام کے لحن سے حصہ نہ ملا تو کیا ہوا، وہ اپنے دل کی دھڑکن اورآنسوؤں کی برسات میں خدا کی حمد کے نغمے گاتا ہے۔چھوٹی بڑی ہرنعمت اسے اپنے مالک کی عنایت پراس کا شکرگزاراوراسے ہرلمحہ یادرکھنے والا بناتی ہے۔

اللہ کا مطلوب انسان کیا ہے؟ یہ انسان اپنی شخصیت کی تعمیر کو زندگی کا نصب العین بناتا ہے۔ اسے میرے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطری پاکیزگی کا کوئی حصہ چاہے نہ ملا ہو،مگراس کا آئیڈل آپ ہی کی ہستی ہوتی ہے۔ وہ ان جیسا چاہے نہ بن سکے، مگر بننے کی کوشش کرتا ہے۔وہ ہمدرد، نرم خو، درگزر کرنے والا، محبت کرنے والا بننا چاہتا ہے۔عدل، احسان، انفاق اس کی زندگی کے تین بنیادی اصول ہوتے ہیں۔حیااس کا کرداراور پاکیزگی اس کی سیرت ہوتی ہے۔ایمان اس کی زندگی، رحم اس کی شناخت اور ہمدردی اس کی سوچ ہوتی ہے۔دین اس کی زبان کا چٹخارہ نہیں دل کا درد ہوتا ہے۔یہی درد جب دعوت بن کر پھوٹتا ہےتو پتھر بھی پگھل جاتے ہیں۔

آہ! مگرآج کا مسلمان کیا ہے۔صبر سے خالی، منفی سوچ سے عبارت، مایوسی کی تصویراور بے عملی کا نمونہ۔اس کی انگلی ہمیشہ دوسروں کی طرف اٹھی ہوئی، زبان شعلے اگلتی، ذہن میں نفرت کا لاوہ کھولتا، نگاہیں سازشوں کی متلاشی، سینہ کدورت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔وہ اپنے سوا ہر شخص کو گمراہ سمجھتا، فتوے لگاتا اور دوسروں پراپنے تصورات کو آخری سچائی سمجھ کر ٹھونستا ہے۔

آج دنیا کو اللہ کے مطلوب انسان کی ضرورت ہے جو سراپا درد، پیکر دعوت، اعلیٰ سیرت، علم، حلم اور معرفت کا پیکر ہوتا ہے نہ کہ آج کے مسلمان کی، جو زوال یافتہ مسلم قومیت کا ایک فرد ہے۔

بیٹری اور موبائل فون

موبائل فون دور جدید میں ہر انسان کی ضرورت بن گئے ہیں۔ خاص کر سفر میں تو لوگ اس کے بغیر نکلنے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ تاہم موبائل فون کی یہ خامی ہے کہ لینڈ فون کے برعکس یہ بیٹری سے چلتا ہے جو کچھ دیر استعمال کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسے چارج کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تاہم اکثر اوقات طویل سفر میں بیٹری کو چارج کرنے کی سہولت نہیں ملتی۔ چنانچہ سفر میں لوگ بہت محتاط ہو کر صرف ضرورت کی جگہ پر موبائل فون کو استعمال کرتے ہیں۔

دنیا کے سفر میں انسانوں کو دی گئی زندگی ایسی ہی ایک بیٹری کے سہارے رواں دواں ہے۔ مگر اس سفر میں بیٹری کو چارج کرنے کی کوئی سہولت نہیں۔ زندگی کی اس بیٹری کو بس ایک دفعہ ہی استعمال ہونا ہے۔ جس کے بعد بیٹری ختم، زندگی ختم۔ بدقسمتی سے موبائل کی بیٹری کو دیکھ بھال کر استعمال کرنے والے انسان اکثر اس حقیقت سے غافل رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کی بیٹری ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ڈسچارج ہو رہی ہے، مگر کسی کو فکر نہیں۔

ہمارے ہاں لوگوں کی اوسط عمر ساٹھ ستر سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے ہم میں سے کسی کی بیٹری پچاس فیصد، کسی کی ساٹھ فیصد کسی کی نوے فیصد ختم ہو چکی ہے، مگر ہم محتاط نہیں ہوتے۔ ہم وقت کو ضائع کرتے رہتے ہیں۔ فضول باتوں، لایعنی مشغلوں، بے فائدہ بحثوں اور بے وقت آرام میں زندگی کی بچی کھچی بیٹری بھی ضائع کرتے جا رہے ہیں۔ جو یہ نہیں کرتے وہ اپنا وقت دنیا کمانے، جائدادیں بڑھانے، مال و اسباب جمع کرنے، شان و شوکت میں اضافے میں ضائع کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسے لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے جو دس فیصد بچی ہوئی بیٹری سے اپنے موبائل پر وڈیو گیم کھیلنا شروع کر دے۔

ہم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنی بچی ہوئی تھوڑی سی بیٹری پر گیم کھیل رہا ہے یا پھر اسے کسی بامقصد کام میں لگا رہا ہے۔

بہت دیر نہ ہو جائے

یہ دو ہستیوں کا قصہ ہے۔ایک صاحب کمال ...... بے عیب، بے مثل، لازوال اور بے نظیر ہے۔ دوسرا غفلت کا شکار، تعصّبات کا قیدی، جذبات کا غلام اور خواہش کا اسیر ہے۔

ایک رب اعلیٰ ہے۔ ہر تعریف کا مستحق ۔ ہر حمد کا سزاوار۔ جو بھولتا نہیں......اس غلام کو بھی جو اسے بھول جائے۔ وہ اپنے بندوں کی آہ کو سنتا اوران کی مشکلات دور کرتا ہے۔کس قدر اعلیٰ ہے وہ مالک جو اپنے غلام کی پکار پر لبیک کہہ کر ہر دشمن کے مقابلے میں اس کی سپر بن جاتا ہے۔

دوسرا بندہ اسفل ہے۔ بے ہنر، بے وسیلہ، بے ثمر، مگر اعتماد کا عالم یہ ہے کہ خالق دو جہاں کا انکار کرتا ہے۔ مانتا ہے تو شریک ٹھہراتا ہے۔کوئی اور نہ ملے تو نفس کی غلامی شروع کر دیتا ہے۔

ایک العزیز والرحیم ہے کہ جسم کو پالتا اور روح کو ہدایت کی غذا دیتا ہے۔فرشتوں کو بھیجتا، کتابوں کو اتارتا اور انبیا کو مبعوث کرتا کہ غلام کل اس کے حضور رسوا نہ ہوں۔

دوسرا وہ کم سواد ہے جو خدا کے دین کی نصرت کرنے کے بجائے اپنے تعصّبات کے لیے لڑتا ہے۔سچائی کا انکار کرتا ہے۔ایمان کا منکر ہوتا ہے اور اخلاق کو پامال کرتا ہے۔ یہ الزام لگاتا، طعنے دیتا، جھوٹ پھیلاتا اور بہتان تراشتا ہے۔ساتھ میں دعویٰ ایمان بھی کرتا ہے۔

ان دو ہستیوں میں تیرا کیا مقام ہے؟ تو خدا بن نہیں سکتا۔ مجرم بن کر بچ نہیں سکتا۔بس تو بندہ بن جا۔نفس کی غلامی سے نکل۔تعصب کے جال کو کاٹ۔فرقہ کی زنجیر کھول۔نفرت کی قینچی کو چھوڑ۔عبدیت کا جام پی اور توبہ کر لے۔خدا کے غلاموں کے ساتھ حمد کر۔وہ نہ ملیں تو سورج کے ساتھ، چاند کے ساتھ، کائنات کے ساتھ مل کر خدا کی حمد کر...... کہ بہت جلد مجرموں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔حمد کرنے والوں کو حیات ابدی کے چشمہ سے سیراب کر دیا جائے گا۔

اٹھ اب دیر نہ کر۔گندگی کو چھوڑ......زندگی کو لے۔کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔

عورت، مرد اور قرآن

قرآن کریم کی سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے حوالے سے جو احکام دیے ہیں وہ بلا شبہ حکمت و بصیرت کا شاہکار ہیں۔ بلا شبہ یہ احکام ایک علیم و حکیم ہستی ہی دے سکتی ہے۔ ان احکام کا پہلا کمال یہ ہے کہ زنا کو روکنے کے لیے مذہب کی تاریخ میں پہلی دفعہ مردوں کو کچھ احکام دیے گئے ہیں۔ قرآن سے پہلے اور اس کے بعد بھی انسان جب مذہب کو بیان کرتے ہیں تو بدکاری کا اصل سبب عورت کو ٹھہراتے اور اسی پر پابندیاں لگاتے رہے ہیں۔ مگر قرآن مجید نے مرد و زن دونوں کو الگ الگ مخاطب کر کے ایک ہی حکم دیا، لیکن ابتدا مردوں سے کی گئی ہے کہ وہ اپنی نظر کی حفاظت کریں اور حفظ فروج سے کام لیں۔ پھر خاص طور پر مردوں کو ایک بات کہی جو عورتوں کو نہیں کہی۔ وہ یہ کہ ان کے لیے یہ طریقہ پاکیزہ تر ہے اور اللہ ان کے ہر کام سے واقف ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مردوں کے لیے صاف پیغام ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم ہی حدود توڑتے ہو اور تم ہی زنا کی ناپاکی پھیلاتے ہو۔

پھر یہ اللہ تعالیٰ ہی ہیں جو جانتے ہیں کہ خواتین کس پہلو سے زنا پھیلانے میں معاون بنتی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد خواتین کو ایک اضافی حکم دیا گیا۔ مگر اس حکم کا اصل کمال یہ ہے کہ یہ حکم بظاہر عورتوں پر کچھ پابندیاں لگاتا ہے اور ان کے جذبہ نمائش کو کچھ حدود میں لاتا ہے، مگر ساتھ ہی مردوں کی نفسیات کو اس طرح ایڈریس کرتا ہے کہ جب تک کوئی شخص خود شیطان نہ ہو، اس کے ذہن کا خناس بے قابو نہیں ہوسکتا۔

مردوں کی یہ نفسیات ہوتی ہے کہ وہ عورت کو ماں، بہن بیٹی اور ان جیسے کچھ اور رشتوں میں تو ایک پاکیزہ مقام دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، مگر رشتوں کے اس دائرے سے باہر عورت ان کے لیے انسان کم اور صنفِ مخالف زیادہ ہوتی ہے۔ یہ صنف مخالف اپنی نسوانی کشش کو نمایاں

کر دے تو معاشرے کو زنا کی آلودگی سے بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اسی مسئلے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اللہ تعالیٰ نے چن کر ان چیزوں کا انتخاب کیا جو نہ صرف عورتوں کا خاصہ ہیں بلکہ وہی مردوں کے لیے انہیں باعث کشش بھی بناتی ہیں۔ فرمایا کہ اپنے گریبان کو اپنے دوپٹے سے ڈھانپ کر رکھو اور اپنی زیب و زینت کو چھپاؤ۔ حتیٰ کہ تمھارے پاؤں کی پازیب بھی پکار کر یہ اعلان کرنا چاہے کہ میں عورت ہوں تو اسے دبا دو تا کہ مرد کا ذہن انسانیت کو چھوڑ کر تمھاری نسوانیت کی طرف متوجہ نہ ہو۔

ان احکام پر عمل کرنے کے بعد جو معاشرت وجود میں آئے گی اس میں مرد و زن دونوں اپنی نگاہوں کو بے باک چھوڑنے کے بجائے ان پر پہرے بٹھانے والے اور باحیا لباس زیب تن کرنے والے ہوں گے۔ اس معاشرے کے مرد اپنی پاکیزگی کے بارے میں حساس اور اپنے رب کی نگرانی کے احساس میں خواتین کا سامنا کریں گے۔ جبکہ خواتین اپنی نسوانیت اور زینت کی نمائش کر کے اپنی نسوانی کشش کو نمایاں کرنے کے بجائے بحیثیت انسان خود کو متعارف کرانے والی ہوں گی۔

بلاشبہ یہ احکام اعتدال اور توازن کا شاہکار ہیں۔ یہ احکام ہر طرح کے حالات، ہر قوم، ہر ماحول، ہر موسم، ہر جغرافیے میں قابل عمل ہیں۔ یہ ازل سے ابد تک پھیلے اس انسانی مسئلے کو بہت آسانی سے حل کر دیتے ہیں۔ ان میں کوئی افراط نہیں کوئی تفریط نہیں۔ ان سے معمولات زندگی متاثر نہیں ہوتے، خاندانی تعلقات ختم نہیں ہوتے، سماج میں دیواریں کھڑی نہیں ہوتیں، مگر یہ معاشرے سے بدکاری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ ان احکام کے بعد کوئی مرد اور عورت قیامت کے دن اللہ کے حضور یہ نہیں کہہ سکتا کہ پروردگار میں جس ماحول میں جیتا تھا، جس معاشرت میں رہتا تھا، جس موسم کو جھیلتا تھا، جس دور میں کھڑا تھا وہاں آپ کی بات قابل عمل ہی نہیں تھی۔ اس اعتبار

سے یہ حکم گویا کہ ہر زمانے اور ہر دور کے مرد وزن پر اتمام حجت کر دیتا ہے کہ اللہ کا مطالبہ بہت آسان اور قابل عمل تھا۔اس کے بعد بھی لوگ عمل نہیں کرتے تو اس کا کوئی عذر ان کے پاس نہیں رہ جاتا۔

جو شخص مرد وعورت کی نفسیات سے واقف ہے اور انسانی سماج کے مسائل کا ادراک رکھتا ہے وہ ان احکام کی حکمت سمجھتے ہی سجدے میں گرنے پر خود کو مجبور پائے گا۔ ہر انصاف پسند انسان مانے گا کہ یہ احکام ہر افراط وتفریط سے پاک ہیں۔ نہ قرآن سے پہلے کبھی کسی نے اس مسئلے کی جڑ کو سمجھا نہ بعد میں سمجھ سکا۔ نہ کوئی پہلے اس کا مکمل اور ہر طرح کے حالات میں قابل عمل حل دے سکا نہ بعد میں دے سکا۔ یہی ان آیات مبارکہ کا سبق ہے جو قیامت تک ہر مرد اور خاص کر خواتین پر یہ حجت قائم کرتی ہیں کہ دین کے احکام ہر طرح کے حالات میں قابل عمل ہیں۔

''مومن مردوں سے کہہ دو، (اے پیغمبر کہ اگر عورتیں سامنے ہوں تو) وہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اُس سے پوری طرح واقف ہے۔

اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزیں نہ کھولیں، سوائے اُن کے جو اُن میں سے کھلی ہوتی ہیں، اور اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں۔

اور زینت کی چیزیں نہ کھولیں، مگر اپنے شوہر کے سامنے یا اپنے باپ، اپنے شوہر کے باپ، اپنے بیٹوں، اپنے شوہر کے بیٹوں، اپنے بھائیوں، اپنے بھائیوں کے بیٹوں، اپنی بہنوں کے بیٹوں، اپنے میل جول کی عورتوں اور اپنے غلاموں کے سامنے یا اُن زیر دست مردوں کے سامنے جو عورتوں کی خواہش نہیں رکھتے یا اُن بچوں کے سامنے جو عورتوں کی پردے کی چیزوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے۔ اور اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ اُن کی چھپی ہوئی زینت (لوگوں کے لیے) ظاہر ہو جائے۔ اور ایمان والو، سب مل کر اللہ سے رجوع کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔'' (النور 24:30-31)

محض ایک کلمہ

''پروردگار! مجھے واپس بھیج دیجیے کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں، اس میں کچھ نیکی کما لوں۔''، جواب ملے گا: ''ہرگز نہیں! یہ محض ایک کلمہ ہے جو یہ کہہ رہا ہے۔'' (المومنون 23:100)

حسرت و یاس کا یہ جملہ موت کے بعد کی دنیا کو دیکھ کر ایک منکرِ حق کی زبان سے نکلے گا۔ مگر اسے زبان سے نکلا ہوا ایک ''کلمہ'' کہہ کر رد کر دیا جائے گا۔ کم و بیش یہی مکالمہ روزِ حشر ہوگا جب مجرم اللہ کے حضور پیش ہو کر کہیں گے کہ ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے کہ ہم نیک عمل کریں، (السجدہ 32:12)، مگر ان کی یہ بات یا ''کلمہ'' رد کر دیا جائے گا۔

اس طرح کی آیات پڑھ کر ایک بندہ مومن تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کہیں قیامت کے دن اس کے زبان سے نکلے ہوئے کلمہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کو بھی کہیں اسی طرح رد نہ کر دیا جائے۔ اس کا انجام بھی وہی نہ ہو جو منافقین کے کلمہ شہادت کا ہوا تھا:

''یہ منافقین جب تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ بلا شبہ آپ اللہ کے رسول ہیں ...... اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو...... اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں۔'' (المنافقون 63:1)

بندہ مومن یہ سوچ کر لرز اٹھتا ہے کہ کہیں قیامت کے دن اسے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ تمھارا ایمان ایک نسلی گروہ کا ایمان تھا۔ تم اپنی قوم کے لیے جیے اور اسی کے لیے مرے۔ تمھارا ایمان ایک فرقہ کا ایمان تھا۔ تم اسی کے لیے جیے اور اسی کے لیے مرے۔ تمھارا ایمان مفادات کا ایمان تھا۔ تم اپنے مفادات کے لیے جیے اور انھی کے لیے مرے۔ تمھارا ایمان تعصّبات کا ایمان تھا۔ تم اپنے تعصّبات کے لیے جیے اور انھی کے لیے مرے۔ تم نے ساری زندگی سچائی کو اپنی قوم، اپنے فرقے، اپنے مفاد اور اپنے تعصب کی عینک سے دیکھا۔

میرا کلام تمھارے پاس آیا۔مگر تم نے اسے اپنی ہی عینک سے دیکھا۔ میرا حبیب تمھارے پاس رہا۔تم نے اسے بھی اپنی ہی عینک سے دیکھا۔ پھر میرے غلام تمھارے پاس آتے رہے۔ وہ تمھیں سمجھاتے رہے۔ایمان و اخلاق کی دعوت دیتے رہے۔عمل صالح کی طرف بلاتے رہے۔

مگر تم ہر واضح سچائی کو دیکھنے کے لیے بھی اندھے بنے رہے۔ جو چیز تمھاری خواہشات کے خلاف ہوتی، تم اسے اٹھا کر اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینکتے رہے۔ جو چیز تمھارے تعصّبات کے خلاف ہوتی تم بلا سوچے سمجھے اس کے خلاف ہو گئے۔تم دنیا کا سودا خریدنے چار دکانوں پر جاتے تھے مگر جنت کا سودا تمھیں اتنا سستا لگا کہ جہاں پیدا ہو گئے، جہاں پہلے بیٹھ گئے اس سے ہٹ کر ہر دوسری بات سننے سے انکار کر دیا۔ یہ تمھارا ایمان تھا؟

تمھارا اخلاق یہ تھا کہ تم جھوٹ بولتے رہے اور اسے پھیلاتے رہے۔تم ہر بربریت کو اگر اور مگر کی ڈھال فراہم کر کے مجرموں کو بچاتے رہے ۔تم الزام و بہتان کی بھٹی پر نفرت کی دیگیں پکاتے رہے۔تم میرے بہترین بندوں کے دشمن بن گئے ۔تم نے کتنوں کو مار ڈالا اور کتنوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کے خلاف جھوٹی مہم چلا کر انھیں بدنام کیا۔

تم حیا کی باتیں کرتے تھے، مگر ذاتی زندگی میں ہر بے حیائی کے مرتکب ہوتے تھے۔تم جنت کی باتیں کرتے تھے۔مگر تم نے دولت کے ڈھیر اس دنیا کے لیے جمع کر رکھے تھے۔تم دوسروں پر اسلام نافذ کرتے رہے، مگر تمھاری اپنی روح ایمان کی ہر حرارت سے محروم رہی ۔تم لوگوں میں روتے رہے اور دوسروں کو رلاتے رہے۔مگر تمھاری تنہائی آنسوؤں سے خالی اور زبان گالیوں سے عبارت تھی ۔تم تقریروں میں اسلاف کی باتے کرتے تھے، مگر اسلام کا تحمل اور رواداری کی تمھیں ہوا بھی نہیں لگی۔ جاؤ آج تمھارا ایمان مردود ہے۔ جاؤ تمھارا کلمہ شہادت رد کیا جاتا ہے۔

کیسا عجیب ہو گا وہ وقت جب بڑے بڑے ''مومنوں'' کا ایمان رد کر دیا جائے گا۔

انتخاب

قرآن مجید کے مطابق اس دنیا میں انسان جس امتحان میں ہیں، وہ کسی قسم کا جبر نہیں بلکہ ان کا اپنا انتخاب ہے(احزاب 72:33)۔اس دنیا کا امتحان چونکہ اخلاقی نوعیت کا ہے اس لیے اخلاقی معاملات میں انسانوں کے پاس یہ اختیار ہر حال میں موجود رہتا ہے کہ وہ خیر کو چنتا ہے یا شر کو۔نیکی کو چنتا ہے یا بدی کو۔دیانت کو چنتا ہے یا بددیانتی کو۔انسان کا یہی وہ اختیار ہے جس کے نتیجے میں جنت یا جہنم میں سے کوئی ایک منزل انسان کا ابدی مستقر بن جائے گی۔

جنت کی ابدی زندگی ،لافانی عیش وعشرت،لازوال حسن وشباب، غیر منقطع نعمتیں، غیر ممنوع لذتیں، بے حساب انعام، بے شمار اکرام؛غرض ہر وہ چیز جس کا انسان تصور کرسکتا ہے،اس ابدی ٹھکانے پر انسان کی منتظر ہیں۔اس کے برعکس انسان کو دوسرا ممکنہ ٹھکانہ جہنم کا ختم نہ ہونے والا عذاب اور برداشت نہ ہونے والی سختیاں ہیں۔

تاہم یہ بات نظریاتی پہلو سے کہی اور لکھی جاسکتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جہنم اپنی ذات میں ایک ناقابل انتخاب جگہ ہے۔اس انسان کے لیے جو لو کی تپش نہ جھیل سکے، آگ کی لپٹ کیسے کوئی انتخاب بن سکتی ہے۔ جو انسان سوئی کی چبھن برداشت نہ کر سکے،اس کے لیے لمحہ لمحہ میں شکلیں بدل کر جسم اور دماغ کو توڑ دینے والے عذاب سرے سے کوئی چوائس ہی نہیں ہیں۔

جس انسان کو یہ احساس ہوجائے کہ اس کے سامنے دو ہی ممکنہ انجام ہیں اور اس میں سے دوسرا انجام درحقیقت کوئی چوائس ہی نہیں وہ تڑپ اٹھتا ہے۔انسان کے وجود سے پھوٹنے والی ساری نیکی اسی تڑپ کا نتیجہ ہوتی ہے۔انسان کا سارا تقویٰ اسی احساس کا مرہون منت ہوتا ہے۔ مگر جو بدنصیب اس احساس کے بغیر جیتے ہیں وہ گناہ اور اخلاقی پستی کو اپنا انتخاب بناتے ہیں۔ اور نتیجے کے طور پر جہنم کا وہ انجام ان کا مقدر بن جاتا ہے جو کسی صورت کوئی انتخاب نہیں۔

جنت میں پیچھے رہنے والے

آپ کا جاننے والا کوئی شخص اگر کوئی تقریب منعقد کرے اوراس میں آپ کے تمام احباب اور رشتہ داروں کو بلائے، مگر آپ کو نہ بلائے تو یقیناً آپ اس میں اپنی توہین محسوس کریں گے۔ خاص کر جب کہ یہ دعوت نامہ آپ کے سامنے ہی دوسروں کو دیا جارہا ہو۔

اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے لیے عزت نفس بہت بڑی چیز ہے۔کھانا پینا اور کسی تقریب میں جانے سے زیادہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ اسے کمتر سمجھا گیا۔اس لیے یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص اس طرح کی چیزوں سے اوپر اٹھ سکے۔اس طرح کی چیزوں سے بلند ہونے کا حوصلہ صرف انھی انسانوں میں پیدا ہوتا ہے جن کا نصب العین جنت میں پروردگار عالم کا قرب تلاش کرنا ہوتا ہے۔جو کسی صورت جنت میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے۔

ان کو ہمہ وقت یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ کل قیامت کے دن وہ ٹھکرا دیے گئے تو ان کا کیا ہوگا۔جنت میں ان کے سارے جاننے والے چلے گئے اور وہ نہیں جاسکے تو کیا ہوگا۔ جنت میں انبیا علیھم السلام کی محفلوں میں ان کو نہیں بلایا گیا اور ان کے اردگرد کے لوگوں کو بلالیا گیا تو ان کو کیا محسوس ہوگا۔فردوس کے مالک نے اپنی خصوصی ملاقات میں ان کے احباب اور ہم عصر واقف کاروں کو بلالیا اور ان کو نہ بلایا تو وہ یہ کیسے برداشت کرسکیں گے۔

یہ لوگ اس احساس سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ان کی راتوں کی نینداس اندیشے سے اڑ جاتی ہے۔وہ پوری قوت کے ساتھ اپنا احتساب شروع کرتے ہیں۔وہ تعصب،خواہش،غفلت کی ہر اس غلاظت کو اپنے اندر سے کھرچ کر پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے لباس ایمان اور لباس تقویٰ کو داغدار کرنے والی ہوتی ہے۔وہ نیکیوں میں سبقت لے جانے کا عزم کرتے ہیں۔کیونکہ یہی اضافی اور نفل نیکیاں جنت کے اعلیٰ مقامات کی ضامن ہیں۔

پتھریلا راستہ

قرآن کریم میں سو سے زائد مقامات پر صبر کا ذکر ہے۔ صبر اتنی بڑی چیز ہے کہ اسے جنت میں جانے کا ذریعہ (الدہر 12:76، الرعد 22:13)، اجر بے حساب (الزمر 10:39) کی وجہ اور معیت الٰہی کا سبب (البقرہ 153:2) قرار دیا گیا ہے۔

صبر کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ یہ ایمان لانے کے بعد اس کے تقاضوں پر جمے رہنے، راہ حق میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرنے، زندگی کی آزمائشوں کو رضائے الٰہی کے لیے حوصلے سے جھیلنے اور دعوت حق کے مخالفین کے بیہودہ پروپیگنڈے کے مقابلے میں تحمل اور برداشت سے کام لینے کا نام ہے۔

مذکورہ بالا تمام مواقع پر انسان کو ایک طرف خارجی محرکات کے مقابلے میں اپنے نفس پر قابو پانا ہوتا ہے تو دوسری طرف اپنے اندر پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ کو برداشت بھی کرنا ہوتا ہے۔ پہلے کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک نوجوان کے سامنے جب کوئی فحش منظر آئے تو اسے اپنے آپ سے جنگ کرکے خواہش نفس پر قابو پانا ہوگا۔ ایک اور مثال گہری نیند سے بیدار ہوکر فجر کی نماز پڑھنا ہے۔ اس کے لیے بھی خود سے لڑنا پڑتا ہے۔ جبکہ اپنے اندر کے غصے اور جھنجھلاہٹ کو برداشت کرنے کی ایک مثال بیماری یا کاروباری نقصان پر خود کو تلخی اور شکوے شکایت سے روکنا ہے۔ ایک اور مثال کسی شخص کا آپ کو گالی دینا ہے۔ اس کے جواب میں غصہ آنا ایک فطری امر ہے۔ مگر جواب میں خود کو گالی دینے سے روکنا اور اپنی توہین برداشت کرلینا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اسی طرح ایک داعی کے لیے جھوٹے پروپیگنڈے اور الزام و بہتان کی یلغار میں صبر سے کام لینا بلاشبہ پیغمبرانہ حوصلے کا کام ہے۔

صبر کا راستہ پتھریلا ہے۔ مگر اس کی منزل جنت کے ابدی باغ ہیں۔ ایک صابر شخص جب وہاں پہنچے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ راہ کا ہر پتھر ایک پھول تھا جس سے اس کی زندگی مہک اٹھی ہے۔

مبارک ہیں وہ......

انسان ایک ایسی دنیا میں جیتے ہیں جہاں سب سے زیادہ قابل ذکر ہستی اللہ رب العالمین کی ہے۔مگران کے ہاں سب سے کم اسی کی ہستی زیر بحث آتی ہے۔ یہ وہ سب سے بڑا المیہ ہے جو آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر رونما ہو رہا ہے۔اور شاید اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک عالم کا پروردگار ان آسمان وزمین کو ایک نئے آسمان وزمین سے نہیں بدل دے گا۔

ہمیں وجود دینے سے لے کر ہر لمحہ ہماری آتی جاتی سانسوں تک، ہمارے دل کی دھڑکن سے لے کر ہمارے رزق وروزگار تک، ہمارے لیے روشن سورج سے لے کر ہوا، پانی اور خوراک تک کے ہر چھوٹے بڑے معاملے کا کلی انحصار اللہ کی کرم نوازی اور عطا پر ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ جو رب ہماری زندگی میں اس درجہ دخیل ہے، ہم ہر لمحہ اس کی حمد، تسبیح اور تعریف کرتے رہیں۔جس کے ہاتھ میں ساری بھلائی اور جو ہر شر سے بچانے کی طاقت رکھتا ہے، ہم ہر لحظہ اس کے سامنے سراپا التجا بنے رہیں۔مگر حیرت انگیز طور پر انسان جو خوردبین اور دوربین سے نا قابل مشاہدہ دنیا کو بھی دیکھ چکا ہے، ایسے عظیم الشان خدا کو دیکھنے کے لیے اندھا بنا رہتا ہے۔

لیکن جو لوگ اس اندھے پن سے نکل جاتے اور خدا کی یاد کو زندگی بنا لیتے ہیں، وہ پہلے مرحلے پر خدا کو سنتا ہوا اور اگلے مرحلے پر سب کچھ کرتا ہوا دیکھنے لگتے ہیں۔وہ پکارتے ہیں اور خدا ان کی فریاد سن لیتا ہے۔مانگی ہوئی چیز نہ ملے تو بہتر مل جاتی ہے اور اس سے بہتر ذخیرہ کر لی جاتی ہے۔کوئی چیز نہ ملے تو اس کے نہ ملنے کی مصلحت ان پر کھول دی جاتی ہے۔یوں وہ خدا کو سب کچھ کرتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ان کا ایمان یقین میں بدل جاتا ہے۔

خدا ایک زندہ و جاوید حقیقت ہے۔اُس کی دریافت ایمانی سفر کی وہ درمیانی منزل ہے جو ہر اس شخص کو آخر کار نصیب ہوتی ہے جو تعصّبات اور خواہشات سے اوپر اٹھ جائے۔اس سفر کی آخری منزل جنت میں خدا کا قرب ہے۔مبارک ہیں وہ جو اس راستے کے مسافر ہیں۔

مال اور حق پرستی

قرآن مجید میں انفاق کے ضمن میں سورہ بقرہ (265:2) میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہ اہل ایمان اپنا مال اللہ کی رضا اور اپنے آپ کو راہ حق پر جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کی رضا والی بات تو بالعموم لوگوں پر واضح ہے لیکن یہ بات کہ مال خرچ کرنا راہ حق پر انسان کو استقامت دیتا ہے وضاحت طلب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مال ہر دور میں دنیا کے قائم مقام رہا ہے۔ خواہش اور خواب کو حقیقت کا روپ دینے والی شے مال و دولت ہی ہے۔ انسان مال سے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کا جھمگٹا اپنے گرد اکٹھا کرسکتا ہے۔ تاہم کسی کے پاس لامحدود مال نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ہر خواہش پوری کرسکے۔ اور اگر مال ہو تب بھی بہت کچھ حاصل کرنے کی دوڑ میں انسان حلال و حرام کی حدود کو فراموش کرسکتا ہے۔

یوں انسان اگر مال سے مقصود صرف یہ بنالے کہ اسے اپنی ہر خواہش پوری کرنی ہے تو جلد یا بدیر وہ راہ حق سے ڈگمگا جائے گا۔ لیکن جو لوگ اپنے مال دوسرے انسانوں پر اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ گویا اپنی تربیت کرتے ہیں کہ ان کے مال پر ان کی خواہشات ہی کا نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کی ضروریات اور اللہ کے دین کے تقاضوں کا بھی حق ہے۔

یوں نفس اور خواہش کے بے لگام گھوڑے کو انفاق کے چابک سے قابو کیا جاتا ہے۔ دوسروں پر خرچ کر کے انسان خود کو یہ سمجھاتا ہے کہ میری خواہشات کی حد وہاں ختم ہوجاتی ہے جہاں دوسروں کی ضروریات شروع ہوتی ہیں۔ انسان خود کو یہ یقین دلاتا ہے کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک دنیا ہے جہاں میرا مال سات سو گنا تک بڑھا کر مجھے دے دیا جائے گا۔ اس روز میرا لگایا ہوا یہ درخت وہ پھل دے گا جو کبھی ختم نہ ہوں گے۔ یہی سچی حق پرستی ہے جو انفاق سے پیدا ہوتی ہے۔

نجات والا ایمان

احادیث کی کتابوں میں کتاب الایمان میں ایک مضمون متعدد طریقے سے آیا ہے۔ان احادیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان لانے والوں کو جنت میں داخلے اور جہنم سے نجات کی خوش خبری دی ہے۔بعض روایات میں تو یہ وضاحت موجود ہے کہ ایسا مومن زنا اور چوری کرنے کے باوجود جنت میں جائے گا،(قال وان زنی و ان سرق، متفق علیہ)۔

ان روایات کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔بظاہر یہ روایات اس عمل صالح کی نفی کردیتی ہیں جو قرآن مجید اور دیگر احادیث کے مطابق جنت کی لازمی شرط ہیں۔تاہم ان روایات کا اصل مدعا اگر واضح ہو تو پھر بات سمجھنی مشکل نہیں۔یہ روایات عمل صالح کی نفی نہیں کرتیں نہ لوگوں کو بدعملی، زنا اور چوری وغیرہ کی چھوٹ دے رہی ہیں۔بلکہ درحقیقت یہ روایات ہر طرح کے تعصب سے بلند ایمان کی عظمت کا بیان ہیں۔یہ ایمان اپنی ذات میں اتنا بڑا عمل ہے کہ نہ صرف پچھلے بلکہ اگلے سارے گناہ بھی معاف کروادیتا ہے۔

ان روایات کے اصلی مخاطب دراصل صحابہ کرام ہیں۔یہ وہ لوگ تھے شرک جن کا آبائی دین تھا۔ان کے تعصّبات خدائے واحد کے بجائے بتوں سے وابستہ تھے۔یہ کلمہ توحید پڑھتے تھے نہ نبی کے نام کے ساتھ درود پڑھتے تھے۔ایک اللہ کی عبادت ان کے لیے انتہائی اجنبی تصور اور بتوں کو چھوڑنے کا تصور ان کے لیے باعث وحشت تھا۔مگر جب نور نبوت کی روشنی پھیلی تو یہ تعصب کی ہر دیوار کو ڈھا کر ایمان لے آئے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدترین پروپیگنڈا اوران کے ماننے والوں پر ظلم شروع ہوگیا۔آپ کی دعوت سے لوگوں کو دور کرنے کے لیے ایسے ایسے نکتے ایجاد کیے گئے کہ عقل حیران رہ جائے۔مثلاً کہا گیا کہ قرآن کریم گھر بیٹھ کر گھڑا جاتا ہے۔الزام لگایا گیا کہ رومی اور عجمی غلام یہ کتاب

املا کراتے ہیں۔ یہ القائے شیطان ہے۔ یہ شاعری اور تک بندی کے سوا کچھ نہیں۔ پچھلوں کی کہانیاں ہیں۔اس شخص پر جادو ہو چکا ہے۔ یہ دوسروں پر جادو کر دیتا ہے۔خاندانوں میں جدائی ڈلوادیتا ہے۔ یہ نبی نہیں ایک مجنون ہے۔ ہم اس کی بات مانیں گے تو عرب سے ہمارا اقتدار ختم ہو جائے گا۔اسے ماننے والے پر بتوں کی لعنت ہوگی۔ یہ سچا ہے تو پچھلے نبیوں کی طرح عصا سے سانپ اور مردہ سے زندہ کیوں نہیں نکالتا۔اس پر خزانے کیوں نہیں اترتے۔فرشتے اس کے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ یہ مستقبل کے واقعات جان کر خود کو نقصانات سے کیوں نہیں بچالیتا۔اس کا خدا ہم سے براہ راست کلام کیوں نہیں کرتا۔ یہ سردار ہے نہ امیر تو اس میں ایسی کیا خوبی ہے کہ ہم کو چھوڑ کر اس پر وحی نازل کی گئی۔ یہ ہمارے اسلاف اور آباواجداد سے ہٹ کر ایک نئے راستے کی طرف بلا رہا ہے۔اور سب سے بڑھ کر اگر یہ سچا ہے تو ہم پر عذاب کیوں نہیں لے آتا۔

گستاخ رسول اور منکر حدیث کی اصطلاحات تو آج کے مسلمانوں نے اپنے مخالفین کو بدنام کرنے کے لیے ایجاد کی ہیں، مگر گستاخی رسول اور انکار رسول کا کون سا طریقہ تھا جو اس دور میں استعمال نہیں کیا گیا۔ایسے میں ''جادوگر، مجنون اور شاعر'' کا خطاب پانے والے کی بات کون سنتا اور کون آباواجداد کے طریقے پر تنقید کرتی کتاب پر ایمان لاکر خود کو مصائب کی بھٹی میں جھونکتا۔اتنے ''مضبوط'' دلائل کے بعد کون بازاروں میں چلتے پھرتے اپنے جیسے ایک بشر پر ایمان لاکر اسے نبی تسلیم کرتا۔ باخدا ہمارے جیسے آج کے مسلمان ہوتے تو اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ایمان لانے کے بجائے کفار کی صف میں جا کر کھڑے ہو جاتے۔ہم بتوں کے پکے ماننے والے بنے رہتے۔ اپنے گھر والوں کو ایمان لانے سے روکتے۔ صادق وامین کے خلاف جھوٹ بولتے اور پوری بے حیائی سے جھوٹ پھیلاتے۔ایمان لانے والوں کو مارتے پیٹتے اور اپنے آبائی دین کی طرف انہیں واپس لانے کی کوشش کرتے۔اس کے ساتھ اپنی حق پرستی کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے۔

لیکن یہ صحابہ کرام کی عظمت تھی کہ وہ ان سارے حالات کے باوجود نہ صرف ایمان لائے بلکہ ہر طرح کے ظلم کے باوجود اس ایمان پر ڈٹے رہے۔انہوں نے پروپیگنڈے کی اس کالی آندھی کے باوجود اندھا بنے رہنے سے انکار کردیا۔مخالفت کے ہر طوفان کے باوجود داعی حق کی پکار پر بہرہ بننے سے انکار کردیا۔نفرت کے ہر سیلاب کا سامنا کر کے رب واحد کی بندگی کی شاہراہ کو چھوڑنے سے انکار کردیا۔

ان کا ایمان ان کا پیدائشی عقیدہ نہیں تھا بلکہ ان کی زندگی میں کیا جانے والا سب سے بڑا عمل بھی تھا۔اپنے تعصّبات کے خلاف ایمان لانے کا یہ عمل اتنا بڑا تھا کہ اس کے نتیجے میں ان کے ہر سابقہ گناہ کو معاف کردیا گیا۔اپنے جذبات کے خلاف ایمان لانا اتنا بڑا کام تھا کہ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ جذبات میں آ کر ان سے کسی گناہ کا ارتکاب ہوجاتا۔لیکن باخدا سرکار دوعالم، محسن انسانیت اور کائنات کے سب سے بڑے عارف نے بالکل درست کہا کہ اس کے بعد اگر زنا اور چوری بھی ہوجائے تو یہ گناہ ایسے ایمان لانے والے کو کسی صورت جنت میں جانے سے نہیں روک سکتا۔باخدا ایمان کے اس من کے آگے زنا کا تولہ اور چوری کا ماشہ کیا وزن رکھتا ہے۔اس عمل کے بعد کوئی عمل اتنا نقصان دہ نہیں رہتا کہ انسان کو جنت سے محروم کردے۔

باخدا میرے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات بالکل درست ہوتی ہے۔آپ ان روایات میں یہ نہیں بتارہے کہ عمل صالح کی کوئی حیثیت نہیں ۔ آپ یہ نہیں بتارہے کہ زنا اور چوری کرنا چھوٹی چیزیں ہیں۔آپ یہ بتارہے ہیں کہ اپنے تعصّبات کے خلاف جا کر ایمان لانا اتنا بڑا عمل ہے کہ اس کے مقابلے کا کوئی عمل اس کائنات میں موجود نہیں۔

آہ مگر یہ کیسا عجیب سانحہ ہے کہ آج نبی کے نام لیوا بہت ہیں۔مگر صحابہ کرام کی طرح تعصب کی ہر زنجیر کو کاٹ کر ایمان کا طوق پہننے والے ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔

مسلمان کیوں متحد نہیں؟

مسلمانوں کی جدید تاریخ میں جو نعرہ سب سے زیادہ مقبول رہا ہے وہ مسلمانوں کے اتحاد کا نعرہ ہے۔ جمال الدین افغانی (1838-1897) کے پان اسلامائزیشن سے لے کر موجودہ دور کی احیائے خلافت تک کی تحریکوں تک سب کا مرکزی خیال یہی خواہش ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان متحد ہو جائیں اور دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام بحال کریں۔

یہ خواہش یا خیال اپنی ذات میں بہت محمود ہے۔ مسلمانوں کے اتحاد اور دنیا پر ان کے اقتدار کا کون مخالف ہوسکتا ہے۔ مگر انیسویں صدی سے آج تک یہ خواہش ایک خواب ہی بنی رہی ہے اور نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر مسلمان درجنوں ریاستوں میں اپنے اپنے سیاسی، تہذیبی، سماجی اور مسلکی اختلافات کے ساتھ منتشر ہیں۔

اس کے برعکس جدید دنیا میں لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ رونما ہوتے ہوئے دیکھا ہے کہ ہزاروں سال سے بہت سی ریاستوں میں منقسم اور شدید ترین نوعیت کی باہمی جنگوں اور رقابتوں کا شکار یورپ، یورپی یونین کی شکل میں بتدریج ایک اکائی بننے کی سمت میں اپنا سفر تمام تر مشکلات کے باوجود کامیابی سے طے کررہا ہے۔

جمال الدین افغانی جیسے داعی، علامہ اقبال جیسے مفکر اور شاعر، حسن البنا جیسے مرشد، مولانا مودودی جیسے مصنف، اخوان اور جماعت اسلامی جیسی منظّم جماعتوں اور احیائے خلافت کی متعدد تحریکوں کی موجودگی، عربوں کی بے پناہ دولت اور مسلمانوں کی مسلسل خواہش کے باوجود یہ خواب ہنوز اپنی تعبیر سے محروم ہے تو یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کی وہ الٹی تربیت ہے جو امت مسلمہ میں اتحاد تو کیا پیدا کرے گی، جو تھوڑا بہت اتحاد مسلمانوں میں باقی ہے، اس کو بھی تقسیم در تقسیم کیے جارہی

ہے۔ یہ الٹی تربیت اپنے تعصّبات میں جکڑے رہنے اور اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنے کی تربیت ہے۔ ہمارا سانحہ یہ ہے کہ جو لیڈر اور بڑا آدمی پیدا ہوجاتا ہے وہ باتیں تو اتحاد و اتفاق کی کرتا ہے لیکن کچھ ہی عرصے میں اس کی اپنی شخصیت، اپنی جماعت، اپنا فرقہ، اپنا گروہ عین مطلوب بن جاتا ہے جس سے اختلاف رائے کرنا ممکن نہیں رہتا۔

آپ کسی شخصیت سے وابستہ ہوجائیں تو اس سے اختلاف رائے کرنا ایک جرم بن جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اس کے ساتھ مل کر کوئی کام کرسکیں۔ آپ کسی جماعت کے ساتھ وابستہ ہوجائیں تو اس کا پہلا مشن آپ کی انفرادیت کو کچل کر اپنا ذہنی غلام بنانا ہوگا۔ آپ مزاحمت کریں گے تو یہ گروپ آپ کو اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ آپ کسی مسلک میں پیدا ہوگئے ہیں تو ذرہ برابر اختلافی بات آپ کو بد دین اور گمراہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

اس رویے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی ذہین اور باصلاحیت آدمی کسی اجتماعیت سے وابستہ نہیں رہ پاتا۔ نتیجتاً وہ ہر طرح کے وسائل سے محروم ہوکر اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے قاصر رہ جاتا ہے۔ جو لوگ باقی رہتے ہیں ان کے پاس وسائل بہت ہوتے ہیں صلاحیت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے بے صلاحیت لوگ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کرسکتے۔ ہاں وہ دین کے کام کو دکانداری میں ضرور تبدیل کردیتے ہیں۔

باقی جو کوئی باصلاحیت آدمی کسی طور اپنی الگ شناخت بنانے لگتا ہے اس کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈا مہم شروع کردی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں تعصب کا زہر جو پہلے ہی معاشرے کو تقسیم کیے ہوئے ہے وہ مزید نئی تقسیم پیدا کردیتا ہے۔ تعصب کا شکار یہ شخص اگر بہت باصلاحیت ہے تو تھوڑے عرصے میں اپنی شناخت پیدا کرلیتا ہے، مگر پھر وہی اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنے کا مرض اسی نئے گروہ اور جماعت میں جنم لے لیتا ہے اور پھر ایک دفعہ وہی کہانی شروع

ہو جاتی ہے۔

اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بتدریج مسلمانوں میں یہ رویے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مثلاً جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی صلاحیت اپنی جگہ مگر ان کے دور میں یہ رویے اس قدر شدید نہ تھے۔ جمال الدین افغانی اگر آج زندہ ہوتے تو اہل تشیعہ کے ایجنٹ کہلاتے۔ علامہ اقبال پر گرچہ ان کی زندگی ہی میں کفر کا فتویٰ لگ گیا تھا، مگر آج کے دور میں ہوتے تو ان کے خلاف اتنا شدید پروپیگنڈا ہوتا کہ ''کافر اور گمراہ اقبال'' کے اشعار پڑھنے کے بجائے لوگ ان کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگا لیتے۔ مولانا مودودی بھی گرچہ اپنی زندگی میں ''امریکہ کا ایجنٹ'' اور ایک عظیم ''فتنہ'' ہونے کا خطاب پا چکے تھے، مگر اِس دور میں ہوتے تو طبعی عمر پوری کرنے کے بجائے کسی قاتلانہ حملے میں جام شہادت نوش کر چکے ہوتے۔

اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ مسلمانوں میں اختلاف رائے کو مٹا دینے کی سوچ کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ سوچنے والے باصلاحیت اذہان اختلاف رائے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ یہ کرتے رہیں گے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ تعصب ایک زہر ہے۔ یہ زہر جس کے دماغ میں پکتا ہے آخرکار اسی برتن کو کھا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ خود قوم وملت کے لیے بھی تباہ کن ہے۔ یہ مسلمانوں کے اتحاد کا سب سے بڑا قاتل ہے۔ اس کی موجودگی میں مسلمانوں کے اتحاد کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

اتحاد پیدا کرنا ہے تو اختلاف رائے کو برداشت کرنا ہوگا۔ امت کو ایک کرنا ہے تو تعصب کو جڑ سے اکھاڑنا ہوگا۔ ان چیزوں کے بغیر اتحاد کا راگ کتنا بھی الاپا جائے عملی زندگی میں کبھی معنی خیز تبدیلی نہیں لا سکتا۔

کھونا اور پانا

انبیا علیھم السلام کی قومیں جب زوال پذیر ہوتی ہیں تو ایسا کم ہوتا ہے کہ وہ دین کا نام لینا چھوڑ دیں یا ان میں دینی جذبہ کم پڑ جائے۔ ہوتا اکثر یہ ہے کہ ان کی اصل وفاداری اللہ اور اس کے رسولوں سے ہٹ کر اپنے قومی اور فرقہ وارانہ تعصّبات کی طرف ہو جاتی ہے۔

یہود و نصاریٰ اس کی بہترین مثال ہیں۔ یہود قوم پرستی کی سب بڑی مثال ہیں۔ ان کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ دنیا میں سچائی کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں۔ خدا کے بندوں کو خدا تک پہنچائیں۔ مگر صدیوں کے زوال کے بعد ان کے قومی تعصّبات ان پر اتنے غالب آ گئے کہ وہ ایک داعی گروہ کے بجائے ایک قوم بن بیٹھے۔ یہودی قوم کا غلبہ، یہودیوں کا وطن، یہودیوں کی تہذیب ان کا سب سے بڑا مسئلہ بن گئی۔ یہاں تک کہ وہ اس قوم پرستی کے پیچھے اپنے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جان کے دشمن ہو گئے، مگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔

نصاریٰ فرقہ وارانہ تعصّبات کی آخری انتہا تک جا پہنچے۔ وہ یہود کا ایک اصلاحی گروہ تھے جو حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئے تھے۔ مگر اس کے بعد وہ گروہ در گروہ بٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ اس معاملے میں یہود سے بھی بہت آگے نکل گئے۔ اس وقت بھی دنیا بھر میں عیسائیوں کے 43 ہزار سے زیادہ فرقے پائے جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے مسلمان بھی فرقہ پرستی اور قوم پرستی میں یہود و نصاریٰ سے پیچھے نہیں۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ خدا کو پانے کے لیے اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے۔ آہ مگر آج کا مسلمان اپنی فرقہ وارانہ اور قوم پرستانہ سوچ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اپنے آپ کو کیا چھوڑے گا۔ اور نہیں چھوڑ سکتا تو نہیں پا سکتا۔ خدا کو نہیں پا سکتا۔ سچائی کو نہیں پا سکتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی حقانیت کو نہیں پا سکتا۔ ہدایت کو نہیں پا سکتا اور آخرکار جنت کو نہیں پا سکتا۔ چاہے کتنا بڑا ہی اسلام کا دعویدار ہو۔ چاہے کتنا بڑا ہی خدا کا نام لیوا ہو۔

آپ کا شکریہ

اس کرہ ارض پر انسان خدا کی سب سے شاندار تخلیق ہے۔ انسان کی فضیلت کے ہزار ہا پہلو ہیں لیکن سب سے بڑا پہلو انسان کی تخلیقی صلاحیت ہے جس کا نقطہ عروج انسان کی قوت بیان ہے۔ انسان اپنی زبان وقلم سے احساسات، مشاہدات اور تاثرات کو جس خوبی وکمال کے ساتھ ادا کرتا ہے وہ بلاشبہ جان تخلیق ہے۔ مگر اس صلاحیت واستعداد کے ساتھ انسان کو اس دنیا میں ہزار طرح کے عجز لاحق ہیں۔ مگر ان میں سب سے بڑا عجز یہ ہے کہ انسان غیر معمولی قوت بیان رکھنے کے باوجود اپنے مالک کی حمد کرنے سے مکمل طور پر قاصر رہے۔

کلام ؛نظم ،نثر ،خطبہ ،مضمون یا اورکسی شکل میں ہو اپنے جمال وابلاغ کے لیے بہرحال اسالیب زبان کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر خدا کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی بڑائی اور اس کی ثنا ہر اسلوب سے بالاتر ہے۔ خدا کی حمد کس تشبیہ سے بیان ہو، اس جیسا کوئی نہیں۔ خدا کی تعریف کس استعارے میں سمائے ، اس کا سا جمال کسی میں نہیں۔ خدا کی تمثیل کس کے روپ سے دی جائے ، مالک دو جہاں تو بے مثل ہے۔ اس کا تقابل کس سے کیا جائے ، اس کے مقابلے کا کوئی نہیں۔ اس کا ذکر کیسے ہو، وہ ہر جگہ مذکور ہے۔ اس کو حذف کیسے کیا جائے ، وہ ہر ظاہر کا باطن ہے۔ وہ کمال کی جس عظمت پر ہے وہاں اطناب وتفصیل کی کوئی راہ جاتی ہے نہ ایجاز واختصار کا کوئی شارٹ کٹ پہنچتا ہے۔ وہ جمال کے جس مقام پر ہے وہ حقیقت سے بیان ہوسکتا ہے نہ کسی مجاز سے۔

ایسے میں انسان کا واحد سہارا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں جو خدا کے سب سے بڑے عارف تھے۔ اللھم لا نحصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك۔ یہ حقیقت خدا کے آخری نبی ہی بتا سکتے تھے کہ خدا کی تعریف اور ثنا کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ وہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے خود کو سراہا ہے۔ شکریہ! یا رسول اللہ آپ کا شکریہ۔

نبی کا جنازہ اور صحابہؓ کرام

پچھلے دنوں میرے پاس ایک مسیحی نوجوان کا یہ سوال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت ایسا کیوں ہوا کہ صحابہ کرام اور خاص کر حضرات ابوبکر وعمر، ان کی تجہیز وتکفین کی فکر کرنے کے بجائے خلافت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ مسیحی نوجوان کا یہ سوال دراصل ایک پورا نقطۂ نظر ہے جو بہت سی غلط فہمیوں پر مشتمل ہے۔ سرسری معلومات کی بنا پر بہت سے لوگ اس نقطۂ نظر سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حقائق کی روشنی میں اس دعویٰ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کے اجتماعی نظام کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کے معاملات ان کے باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور ان کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے''۔ (شوریٰ 38:42)

قرآنِ پاک کا یہ حکم عرب کے اُس قبائلی معاشرہ میں اترا، جس میں کسی اجتماعی ریاست کا تصور تھا اور نہ کسی واحد حاکمِ اعلیٰ کی کوئی تاریخ ہی پائی جاتی تھی۔ اسلام سے قبل ہر قبیلے کا اپنا سردار ہوتا جو اس کے معاملات چلاتا تھا۔ عرب میں کوئی باقاعدہ ریاست تھی اور نہ اس کا کوئی مستقل حکمران تھا۔ حتیٰ کہ ام القریٰ مکہ کے مرکزی شہر میں بھی کوئی حکمران نہ تھا۔ وہاں بمشکل تمام ایک ڈھیلا ڈھالا نظمِ اجتماعی تھا جس میں قبائلی سردار کسی اجتماعی مسئلے پر اکٹھے ہو جاتے اور مل جل کر کوئی فیصلہ کر لیتے۔

ایسے میں اسلام کا ظہور ہوا۔ ہجرت کے بعد مدینہ کی ریاست وجود میں آئی۔ حضور نبی کریم فطری طور پر اس ریاست کے حکمران تھے۔ 8 ہجری تک یہ ریاست صرف مدینہ اور اس کے اطراف تک محدود تھی۔ پھر فتحِ مکہ کے بعد صرف تین برس میں یہ ریاست پورے عرب میں پھیل

گئی۔ یہ وہ عرب تھا جہاں انتشار واختلاف کے شکار قبائل اور طرح طرح کی عصبیتیں موجود تھیں اور جو پہلی دفعہ کسی ایک حکمران کے ماتحت اکٹھا ہوا تھا۔ مگر لوگوں کا حضور پر بحیثیت رسول ایمان اور حضور کا سب سے برتر قبیلے یعنی قریش سے تعلق وہ چیز تھا جس نے عرب میں یہ سیاسی انقلاب برپا کر دیا۔ تاہم حقیقت یہ تھی کہ نئے ایمان لانے والے قبائل ابھی تک اس پورے نظام کے عادی نہیں ہوئے تھے۔

اپنے آخری وقت میں حضور کو اس صورتحال کا مکمل اندازہ تھا۔ مگر آپ نے اس حوالے سے کوئی بات اس لیے نہیں فرمائی کہ مسلمانوں کے پاس بہرحال اللہ تعالیٰ کا حکم موجود تھا۔ دوسرے حضور کو معلوم تھا کہ آپ نے اس موقع پر اگر لوگوں کو کوئی حکم دے دیا تو وہ تا قیامت سورہ شوریٰ کی مذکورہ بالا آیت کی واحد قابل عمل شکل قرار پائے گی۔ یہ بات اُس وقت کے قبائلی دور کے حساب سے تو ٹھیک ہوتی، مگر آنے والے زمانوں میں حکمران کے انتخاب کے ہر دوسرے طریقے کو غیر اسلامی بنا کر، اسلام کے نا قابل عمل ہونے کا ایک نمایاں ثبوت بن جاتی۔ جبکہ اسلام کو قبائلی دور ہی کا نہیں بلکہ آج کے انفارمیشن دور کا مذہب بننا تھا۔ چنانچہ حضور کو جب اندازہ ہو گیا کہ رخصت کا وقت قریب ہے تو آپ نے اپنی وفات سے پانچ دن قبل مسجدِ نبوی میں آخری خطبہ دیا۔ اس خطبے میں آپ نے مسلمانوں کو آخری وصیتیں کیں، مگر سیاسی حکمرانی کے عملی طریقے کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی۔ البتہ اُس شخص کی طرف اشارہ کر دیا جو آپ کی نظر میں اس منصب کا سب سے بڑھ کر اہل تھا۔ چنانچہ اس موقع پر آپ نے دین اور اپنی رفاقت کے حوالے سے حضرت ابوبکر کی خدمات گنوائیں اور حکم دیا کہ مسجد نبوی میں ان کے دروازے کے سوا ہر دروازہ بند کر دیا جائے (متفق علیہ)۔ اگلے دن سے اپنی جگہ حضرت ابوبکر کو مسجد نبوی کی امامت سونپ کر اپنا منشا لوگوں پر مزید واضح کر دیا (متفق علیہ)۔

چار دن بعد پیر کے روز ظہر سے قبل حضور کا انتقال ہوگیا۔ مسلمانوں پر اپنے محبوب نبی کے رخصت ہونے کا انتہائی شدید صدمہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ دوسری تلخ حقیقت یہ تھی کہ قبائلی عصبیت سے بھرپور عرب کی نئی ریاست میں حکمرانی کا منصب خالی ہو چکا تھا اور کسی جانشین کا ابھی تک تعین نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جو اس پس منظر میں متوقع تھا۔ انصار کے بعض لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھا ہوکر حضور کی جانشینی کے مسئلے پر گفتگو کرنے لگے۔ حضرت ابو بکر جو بلا شک وشبہ اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے، ان سے اس موقع پر اگر معمولی سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ ان حالات میں حضرت ابو بکر حضور کے انتقال کی خبر سن کر سیدھے مسجد نبوی تشریف لائے اور ان شاندار الفاظ سے مسلمانوں کا حوصلہ بلند کیا کہ ''جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ جان لے کہ اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے کبھی نہیں مرے گا''، (بخاری، رقم 3667)۔ اس کے ساتھ ان پر یہ ذمہ داری بھی آن پڑی کہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ چنانچہ وہ حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح جیسے اہم قریشی سرداروں کو لے کر انصار کے ہاں گئے اور ایک طویل بحث و گفتگو کے بعد حضور کے بعض ارشادات کی روشنی میں انصار کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ خلیفہ قریش میں سے ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہر شخص کو معلوم تھا کہ قریشی مسلمانوں میں سب سے بڑا لیڈر کون ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے ان کا نام تجویز کیا جسے سب نے فوراً تسلیم کرلیا۔ یوں ریاستِ مدینہ میں انتشار کا خطرہ ٹل گیا۔ مگر اس پورے عمل میں پیر کے دن کی رات ہوگئی۔ اگلے دن منگل کو حضور کو سیدنا علی اور دیگر قریبی اعزا نے غسل دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسبِ ارشاد آپ کی قبر آپ کی وفات کی جگہ پر ہی بنائی جانی تھی۔ اس لیے تدفین اور نمازِ جنازہ کے لیے کہیں اور جانے کا سوال نہیں

تھا۔اس لیے لوگوں نے گروہ در گروہ آکر سیدہ عائشہ کے اس حجرے ہی میں نماز ادا کی جہاں آپ کا انتقال ہوا تھا۔اس عمل میں منگل کا پورا دن گزر گیا۔پھر منگل اور بدھ کی رات کے درمیانی اوقات میں حضرت عائشہ کے حجرے میں حضور کی تدفین عمل میں آئی۔

یہ ہے وہ بات جس کا افسانہ بنا کر ہمارے بعض مسلمان بھائی اسلام،اس کے نبی اوران کے بہترین پیروکاروں کے بارے میں ایسے سوالات پیدا کر دیتے ہیں جن کی بنا پر نئی نسل اسلام سے بدظن ہو جاتی ہے اور غیر مسلموں کو ہمارا مذاق اڑانے کا موقع مل جاتا ہے۔جبکہ ہر صاحب علم یہ بات جانتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے ابتدائی زمانے میں خلافت کے قیام اور مہاجرین وانصار اور قریشِ مکہ کی بھرپور تائید کے باوجود عرب میں ایک زبردست بغاوت رونما ہوئی۔اندازہ کیجیے کہ اگر حضور کے انتقال کے وقت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فوری فیصلہ کر کے نزاع کو ابتدا ہی میں ختم نہ کرتے اور اہل مدینہ میں باہمی انتشار پیدا ہو جاتا تو مسلمانوں کا کیا انجام ہوتا؟

ہم نے جو کچھ تحریر کیا ہے،اس کی تائید سیدنا علی کے اپنے طرزِ عمل سے ہوتی ہے۔صورتحال کی سنگینی کا اندازہ نہ ہونے کی بنا پر انھیں ابتدا میں یہ شکایت تھی کہ مجھے مشورے میں کیوں شریک نہیں کیا گیا،مگر جب ان پر معاملہ واضح ہو گیا تو انھوں نے سیدنا ابوبکر کی بیعت میں تاخیر نہیں کی۔پھر اس کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے پورے دورِ حکومت میں انھوں نے بھرپور طریقے سے ان حضرات کی معاونت کی اور ہمیشہ ان کے قریب ترین مشیر رہے۔ اوران دونوں نے بھی ہر معاملے میں حضرت علی کی رائے کو مقدم رکھا۔

بلاشبہ صحابہ کرام وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا حق اس طرح ادا کیا کہ قرآنِ مجید نے بھی جگہ جگہ ان کے اخلاص اور قربانی کی گواہی دی ہے۔قرآنِ کریم کی اس گواہی کے بعد ان لوگوں کی صداقت کے لیے کسی اور گواہی کی ضرورت نہیں۔

نرم گدا اور گرم صحرا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے بعد آپ پر زیادہ تر نوجوان اور کمزور طبقات کے لوگ ایمان لائے۔ جبکہ سرداران قریش نے آپ کی دعوت کو رد کر دیا۔ جب دعوت پھیلنے لگی تو ان سرداروں کو اندیشہ ہوا کہ یہ نیا مذہب ان کی طاقت کو مکمل طور پر ختم نہ کر ڈالے۔ چنانچہ ابتدا میں انہوں نے مسلمانوں کو زبانی کلامی سمجھانے کی کوشش شروع کی۔ اس میں ناکامی کے بعد انھوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے۔

اس ظلم کا سب سے بڑا نشانہ وہ غلام اور کنیز بنے جن کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ ان میں بلال، یاسر، صہیب، خباب، عمار، سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین کے نام نمایاں ہیں۔ انھیں بری طرح مارا پیٹا جاتا، گلیوں میں گھسیٹا جاتا، بھوکا پیاسا قید کیا جاتا، جلتے لوہے سے داغا جاتا اور صحرا کی تپتی دوپہر میں زمین پر ننگے بدن لٹا کر اوپر گرم پتھر رکھ دیے جاتے۔ مگر وہ لوگ دین پر قائم رہے۔

ہم لوگ اس طرح کی باتیں جب لکھتے یا پڑھتے ہیں تو ٹھنڈے کمرے، گرم لحاف، نرم گدے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اسے کوئی کہانی سمجھ کر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ ہمیں نہیں احساس کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور ان کے اصحاب کی بے پناہ قربانیوں کی وجہ سے ہمیں ہمیشہ کے لیے اس صورتحال سے نجات دلا دی ہے۔ ہمیں یہ احساس ہو جائے تو ہم پروردگار کے لیے سراپا شکر، نبی رحمت علیہ السلام اور ان کے صحابہ کے لیے سراپا درود بن جائیں۔

مگر ہم نرم گدے اور گرم لحاف میں سوتے ہیں اور فجر میں اٹھنا بھول جاتے ہیں۔ پیٹ بھر کھاتے ہیں اور نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ کاروبار اور تفریح میں ہمیں اللہ کی یاد نہیں رہتی۔ جتنا کچھ ہمارا اسلام ہے وہ ذہنی عیاشی، زبانی جمع خرچ، روحانی انٹرٹینمنٹ کے سوا کچھ نہیں۔ کاش ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ پچھلوں کی قربانیوں نے ہمارے لیے دین پر عمل کتنا آسان کر دیا ہے۔ ہمیں گرم صحرا میں ظلم سہہ کر نہیں نرم گدوں میں آسانی کے ساتھ دین پر عمل کرنا ہے۔

نبی رحمت کی شادیاں: کچھ سوالات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو نشانہ بنانے والے مستشرقین نے ہمیشہ دو چیزوں کو نمایاں کیا ہے۔ایک آپ کی شادیاں اور دوسری آپ کی جنگی مہمات۔ یہ مستشرقین زیادہ تر مسیحی رہے ہیں جن کے مذہب میں رہبانیت کی بھرپور آمیزش ہوگئی ہے۔رہبانیت کے تصورات کے تحت شادی نہ کرنا ایک بہترین عمل اور جنگ وجدل سے بچنا عین عبادت ہے۔اس پس منظر میں ان لوگوں کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرت مبارکہ میں یہی چیزیں سب سے زیادہ قابل اعتراض لگتی ہیں ۔آج کل بھی وقفے وقفے سے مغرب میں توہین رسالت کے جو واقعات کارٹون اور فلموں کی شکل میں سامنے آتے ہیں ان میں انہی دو چیزوں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔پیش نظر مضمون میں ہم حضور کی شادیوں کے حوالے سے بعض حقائق پر توجہ دلا رہے ہیں تاکہ اپنے پرائے شادیوں کی تعداد کے بجائے ان حالات کو دیکھ کر حضور کی سیرت کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔ جہاد پر تبصرہ کبھی بعد میں کیا جائے گا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے متعدد شادیاں کیں۔مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پچیس برس عفیف زندگی گزارنے کے بعد آپ نے حضرت خدیجہ سے نکاح کیا اور پھر اگلے پچیس برس تک آپ نے کسی اور خاتون سے شادی نہیں کی۔عرب کے کلچر میں کسی مرد کی دوسری تیسری شادی ایک معمولی بات تھی۔مگر آپ نے نہ صرف ایسا نہ کیا بلکہ جب اعلان نبوت کے بعد قریش کے سرداروں نے آپ کو پیشکش کی کہ عرب کی حسین ترین عورتوں کو آپ سے بیاہ دیا جائے تو آپ نے ایسی کسی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ جو نقشہ مستشرقین کھینچتے ہیں اس نقشے کا انسان جوانی میں شادی سے قبل کیسے بے داغ رہ سکتا ہے؟ شادی کے بعد وہ پچیس برس تک کیسے صرف ایک خاتون سے نکاح پر قناعت کر سکتا

ہے؟ جس شخص کی جوانی کی سیرت یہ ہو وہ بڑھاپے میں اچانک شادیوں کا شوق کس طرح خوشی پال سکتا ہے؟ مزید یہ کہ آپ کی شادیوں کی نوعیت یہ نہیں کہ آپ نے ایک دم عورتوں سے اپنا حرم بھرلیا ہو۔ بلکہ ایک نبی ،رسول ،لیڈر اور ایک رول ماڈل کے طور پر جب جب ضرورت لاحق ہوئی آپ نے شادیاں کیں۔ پھر جن خواتین سے شادی کی ان میں سیدہ عائشہ کو چھوڑ کر سب بیوہ، مطلقہ اور بال بچے دار خواتین تھیں۔اس پر بھی آپ پر یہ پابندی تھی کہ آپ اپنی کسی بیوی کو طلاق دے کر خود سے الگ نہیں کر سکتے تھے نہ ایک مخصوص دائرے سے باہر شادی کر سکتے تھے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت خدیجہ کے بعد بیوی کی حیثیت سے جو خاتون آپ کی زندگی میں آئیں وہ ایک نوجوان کنواری خاتون یعنی سیدہ عائشہ تھیں۔ احادیث اور سیرت کی کتابوں میں یہ بات واضح ہے کہ سیدہ ہی آپ کے لیے سب سے محبوب ہستی تھیں۔ مگر اس کے باوجود آپ نے جب متعدد شادیاں کیں تو عدل کی غرض سے خود پر یہ پابندی عائد کر دی کہ آپ کا وقت تمام بیویوں میں یکساں تقسیم ہوگا۔ گویا محبوب بیوی کے ساتھ جو وقت آپ گزار سکتے تھے اس کا ایک بڑا حصہ اب دوسری خواتین میں تقسیم ہو گیا۔

جس سیرت کا نقشہ یہ مستشرقین کھینچتے ہیں کیا اس نقشے کا انسان اسی طرح بیوہ، مطلقہ خواتین سے شادیاں کر کے خود پر طرح طرح کی پابندیاں لگاتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ جوانی کے تلاطم سے بے داغ گزرنے والا انسان بڑھاپے کی پرسکون لہروں میں اپنی کشتی بے قابو ہونے دے؟ شادیاں جب خواہش نفس کے لیے کی جاتی ہیں تو خوبصورت ترین عورتوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ عرب کے سردار نے جن کے جنبش ابرو پر سب کچھ ممکن تھا کیا ایسی ہی خواتین سے شادیاں کی تھیں؟ اگر ان سب سوالوں کے جواب نفی میں ہیں اور بلا شبہ نفی میں ہیں پھر درود وسلام بھیجئے اس ذات پر جس نے اپنے عائلی سکون کو اللہ کے حکم اور معاشرے کی ضروریات پر قربان کر دیا۔

ہیرو کی تلاش

ہر انسان فطرتاً ساری زندگی اپنا ایک ہیرو تراش کر اس کی تحسین کرتا رہتا ہے۔ بعض لوگ کسی دوسرے کے بجائے ہیرو کے اس منصب پر اپنی ذات کو فائز کر دیتے ہیں اور ساری زندگی نرگس کے پھول کی طرح اپنے عشق کا آپ شکار ہو کر پانی میں اپنا ہی عکس دیکھتے رہتے ہیں۔

باقی لوگ اپنا ہیرو خارج میں تلاش کرتے ہیں۔ حقیقی دنیا میں چونکہ سپر مین نہیں پائے جاتے، اس لیے جو بھی برا بھلا ہیرو مل جائے لوگ اسی میں سپر مین کی خصوصیات جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے لوگ کسی مذہبی یا قومی لیڈر، کھلاڑی یا فنکار یا اپنے قریبی حلقے میں موجود کسی شخص میں اپنا یہ شوق پورا کر لیتے ہیں۔ اس عمل میں یہ لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ہر ہیرو کے پیچھے درجنوں عوامل کام کر رہے ہوتے ہیں، جن کی غیر موجودگی میں ہر ہیرو ایک زیرو بن جاتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے بے نیاز ہم سب اپنے اپنے ہیرو کی تحسین، تعریف اور تکبیر میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ یہ صرف اللہ جل جلالہ کی ہستی ہے جو اپنی ذات میں کامل اور غنی ہے۔ جو صاحب کمال ہے، مگر کمال کو ظہور میں لانے کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ جو صاحب جمال ہے۔ مگر حسن کی انتہا کو تخلیق کر کے بھی بے پروا رہتا ہے کہ اس کو سراہا جائے۔ جو الحی القیوم ہے۔ مگر اپنی زندگی اور بقا کے لیے کسی کا احسان مند نہیں۔ جو ہر لمحے صناعی کے معجزے تخلیق کرتا ہے۔ مگر اپنی قدرت کاملہ کے ظہور کے لیے ہر فانی مخلوق کی مدد سے بے نیاز ہے۔

آہ! لوگ صنم تراشتے ہیں۔ ہیرو تراشتے ہیں۔ مگر محبوب حقیقی، معبود برحق اور اس صاحب کمال کو بھول جاتے ہیں جو کائنات میں اصل اور واحد ہیرو ہے۔ مگر کیا کیجیے کہ خدا جس طرح نہ ماننے والوں کو نظر نہیں آتا، ماننے والوں کو بھی نظر نہیں آتا۔ ورنہ ہیرو کی تلاش ختم ہو جائے۔

اسٹریس اور ٹینشن

دور جدید میں روزمرہ زندگی کے اسٹریس (Stress) نے انسانی صحت کو بہت متاثر کیا ہے۔تاہم کم ہی لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اسٹریس یا دباؤ اپنی ذات میں کوئی منفی چیز نہیں بلکہ یہ ہماری بقااور ترقی کا ضامن ہے۔مثلاً اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے تو اس کے مکینوں میں فوراً آگ پر قابو پانے کا شدید جذبہ پیدا ہوگا۔اسی بنا پر لوگ فوراً حرکت میں آ کر آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔مشکل حالات میں پیدا ہونے والا یہی جذبہ محرکہ اسٹریس ہے۔

تاہم اسٹریس اور اس کے ردعمل میں پیدا ہونے والی جسمانی اور ذہنی کاوش کے بیچ میں ایک چیز ہوتی ہے۔ یہ ٹینشن یا تناؤ ہے۔اسٹریس جیسے ہی پیدا ہوتا ہے ذہن کچھ کیمیکل خارج کرتا ہے جو ہمارے اعصاب یا نروس سسٹم پر زبردست تناؤ پیدا کر دیتے ہیں۔یہی تناؤ جسم میں وہ اضافی توانائی پیدا کرتا ہے جو کسی مشکل سے نمٹنے میں ہمیں مدد دیتی ہے۔جب مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو اسٹریس ختم ہو جاتا ہےاور نتیجے کےطور پراعصاب پر ٹینشن یا تناؤ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تاہم جب انسان مستقل اسٹریس میں رہنے لگے تو اس کے نتیجے میں اعصاب پر مسلسل تناؤ طاری رہتا ہے۔پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسٹریس ختم ہو جاتا ہے،مگر ہمارے اعصاب کو تناؤ میں رہنے کی عادت ہو جاتی ہے۔انسانی جسم کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ اسٹریس سے نہیں بلکہ اسی تناؤ سے پہنچتا ہے۔دل کا مرض، بلڈ پریشر،معدے اور نظام ہاضمہ کے مسائل کی اصل وجہ یہی اعصابی تناؤ ہے۔اسی لیے اس مسئلے کے حل کی بنیادی کنجی یہ ہے کہ جب بھی اسٹریس طویل ہونے لگے فوراً اس چیز کا جائزہ لیا جائے کہ کیا ہم مستقل تناؤ میں تو نہیں۔اگر ہیں تو گہری سانس لے کر،کسی کھیل کو اختیار کر کے،کسی تفریح میں شامل ہو کر یا کسی اور طریقے سے ٹینشن کو دور کریں۔کیونکہ انسان کے لیے زہر قاتل یہی ٹینشن ہے۔

نارمل انسان

''سر میں آج کل بہت سکون سے ہوں۔'' میں ان کا یہ جملہ سن کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ آج سے پہلے کئی دفعہ وہ میرے پاس اپنی پریشانی اور ٹینشن کا مسئلہ لے کر آئے تھے۔ میں کچھ نہیں بولا لیکن میری خاموشی میں پوشیدہ سوال کو پڑھتے ہوئے وہ خود ہی گویا ہوئے۔

''میں نے اپنے گھر سے اخبار کو تو پہلے بند کرادیا تھا، مگر انٹرنیٹ پر روزانہ تین چار اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ اب انہیں بھی چھوڑ دیا۔ فیس بک سے چن چن کر ان لوگوں کو اپنی فرینڈ لسٹ سے نکال باہر کیا جو سیاسی اور مذہبی اختلافات، فرقہ واریت اور ملکی حالات کے بارے میں منفی خبریں دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ٹی وی پر آنے والے تمام نیوز چینل دیکھنا بند کردیے۔ موبائل پر خبروں کی اپ ڈیٹ آتی تھی وہ بھی بند کرادی۔

اب فارغ وقت میں اچھی کتابیں پڑھتا ہوں۔ گھر والوں سے باتیں کرتا ہوں۔ دوسروں کے دکھ درد میں دلچسپی لیتا ہوں۔ کسی کی مدد کرنا ممکن ہو تو وہ کر دیتا ہوں۔ قرآن مجید سمجھ کر پڑھ لیتا ہوں۔ بس اب زندگی میں سکون ہی سکون ہے۔''

''اور ملکی حالات و معاملات؟'' میں نے ان کے اس سابقہ پس منظر کی روشنی میں انھیں چھیڑتے ہوئے سوال کیا۔ کیونکہ وہ ملکی و بین الاقوامی حالات، اندرونی اور بیرونی سازشوں اور اسی نوعیت کی دیگر چیزوں کو لے کر ہمیشہ انتہائی پریشان رہتے تھے۔

''اب میں نے سمجھ لیا کہ مجھے انھی چیزوں کے بارے میں پریشان ہونا چاہیے جہاں میں کچھ کرسکتا ہوں۔ اور وہ جگہ صرف میرا اقریبی حلقہ ہے۔ باقی معاشرے کے لیے فیس بک پر آپ کے پیج سے ایمان واخلاق اور مثبت سوچ کی باتیں آگے شیئر کر دیتا ہوں۔''

میں نے انھیں مبارکباد دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ آخر کار انھوں نے ایک نارمل زندگی گزارنا شروع کر دی تھی۔

اندھیرے یورپ کی پیروی

اوژیے بوزبک (Ogier Ghiselin de Busbecq) سولھویں صدی کا ایک یورپی مصنف، مورخ، سیاستدان اور سفارتکار تھا۔ وہ سلیمان عالیشان کے دورِ حکومت میں سن 1552 تا1562 قسطنطنیہ کے دربار میں بطورآسٹریلوی سفیرتعینات رہا۔ وہاں قیام کے دوران میں اس نے اپنی مشہورزمانہ تصنیفTurkish Letters لکھی جوعثمانی خلافت اورترکوں کو سمجھنے کے لیےاس دور کے یورپ کے لیےسب سےاہم ماخذ بن گئی۔

اس نے ترکوں کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ ترکوں کو جب کوئی غیرمعمولی اہلیت کا آدمی مل جاتا ہےتو وہ اس کی بہت قدرومنزلت کرتے ہیں۔لیکن ہم (یعنی یورپین) کسی آدمی کی قابلیت کی قدرکرنانہیں جانتے۔ہم نہیں جانتے کہ اسے تعلیم وتربیت دینا ہمارا فرض ہے۔جبکہ ترک قابل آدمیوں سے کام لینا جانتے ہیں۔

بوزبک سلیمان کا ہم عصر ہےجس کے دور میں عثمانی خلافت کا اقتدارمشرقی یورپ سے آگے بڑھ کر وسط یورپ میں آسٹریا تک جاپہنچا تھا اورموسم خلاف نہ ہوجاتا تو اپنی آخری یلغار میں سلیمان ویانا پر قبضہ کرچکا ہوتا۔احیائے علوم کے جوش سے سرشارجنوبی یورپ جواس وقت یورپی تہذیب وثقافت اورقوت کا مرکز تھااورجس نے کچھ عرصے بعد مسلمانوں کواندلس سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا،ترکوں کے نام سےلرزتا تھا۔جبکہ دنیا کے تین براعظموں یعنی ایشیا،افریقہ اور یورپ میں ترکوں کا اقتدارقائم تھا۔

عام طور پرمسلمان ماضی کے اپنے اقتدارکواپنی قوت و بہادری اور اپنی شکستوں کواغیار کی سازشوں کا نتیجہ بتاتے ہیں۔تاہم کسی قوم کےعروج وزوال میں جواہم ترین اور بنیادی وجہ ہوتی ہے، بوزبک نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پراسے بہت اعلیٰ طریقے پر بیان کردیا ہے۔یعنی جو

اقوام اپنے قابل لوگوں کی قدر کرتی ہیں تو عظمت حاصل کرتی ہیں اور جو نہ کریں وہ پیچھے رہ جاتی ہیں۔ بوزبک اور سلیمان دونوں جن تہذیبوں سے تعلق رکھتے تھے وہ اس کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ترکوں کا طریقہ تھا کہ وہ غیر اقوام کے بچوں کو اپنے ہاں لاتے اور انہیں بہترین تربیت دیتے۔ اور پھر ان میں سے بہترین لوگوں کو بلا تعصب اعلیٰ فوجی اور سیاسی عہدے عطا کر دیتے۔ جبکہ یورپ کا بادشاہی اور مذہبی نظام اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا کہ ہر باصلاحیت آدمی کو کچل کر رکھ دے اور مخصوص خاندانوں اور ایک خاص طبقے کا اقتدار باقی رہے۔ یورپ میں یہ صورتحال اٹھارہویں صدی تک باقی رہی، مگر اس کے بعد استحصالی طبقات کو شکست ہوگئی۔

آج حال یہ ہے کہ مغربی ممالک ترکوں کی طرح دیگر اقوام کے اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے نوجوانوں کو اپنے ہاں لاتے ہیں اور بہترین مراعات دے کر ان کی صلاحیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ صلاحیت ان کی قوت میں مسلسل اضافے اور ان کے زوال کو روکنے میں بہت معاون ثابت ہورہی ہے۔ جبکہ دوسری طرف مسلمانوں اور خاص کر اہل پاکستان کم و بیش اسی جگہ پر کھڑے ہیں جہاں قرون وسطیٰ کے عہد جاہلیت کا یورپ تھا۔ جہاں بادشاہ اور اشرافیہ عام لوگوں کو تعلیم و تربیت تو کیا دیتے الٹا ان سے جینے کا حق چھین رکھا تھا۔ وہ ان کا خون نچوڑتے اور بدترین معاشی اور سیاسی استحصال کا نشانہ بناتے۔ چرچ ہر مختلف آواز کو سنتے ہی ان کے ختم کر دینے کا فرمان جاری کر دیتا۔ یورپ کی مسیحی عدالتیں اہل علم و فن پر بددینی کے فتوے لگا کر انہیں قتل کررہی تھیں۔ تنقید اور اختلاف کرنے والے ہر شخص کے لیے جینا مشکل تھا۔ ان کی کتابیں جلا دی جاتیں اور وطن میں رہنا دشوار کر دیا جاتا۔

قابل اور بہتر لوگوں کی اسی ناقدری نے یورپ کو صدیوں اندھیرے میں رکھا۔ اگر آج ہم اُسی اندھیرے یورپ کی پیروی کریں گے تو یہی اندھیرا ہمارا انجام ہوگا۔

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا

کسی شاعر نے اپنے محبوب کے وصل و فراق کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا

اور جنت کیا اور جہنم کیا

شاعری میں یہ مبالغہ عام ہے، مگر حقیقی دنیا میں ایک بندہ مومن بار بار اس تجربے سے گزرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں یہ مرحلہ بار بار آتا ہے کہ کسی وقت انسان پر شوق کا غلبہ ہوتا ہے۔ عبادات میں دل لگتا ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں۔ دل ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ گناہ سے فطری کراہیت محسوس ہوتی ہے۔

مگر پھر ایک روز اچانک یہ کیفیت رخصت ہوجاتی ہے۔ شوق تو دور کی بات ہے، اعمال صالحہ کی طرف طبیعت کا رجوع باقی نہیں رہتا۔ گناہ کی شدید خواہش بیدار ہوجاتی ہے۔ دنوں تک انسان کو یاد بھی نہیں آتا کہ اس کا کوئی رب ہے۔ انسان بہت جبر کرتا ہے تو رسمی طور پر نماز کے نام پر کچھ اٹھک بیٹھک ہوجاتی ہے۔ مگر کسی عبادت میں دل نہیں لگتا۔

پہلی کیفیت صاحب ایمان کے لیے اگر جنت ہوتی ہے تو یہ دوسری کیفیت جہنم سے کم نہیں ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ دونوں کیفیات راہ خدا کے راستے کا لازمی موڑ ہیں۔ پہلا موڑ اس لیے آتا ہے کہ انسان خدا سے تعلق کی لذت کا تجربہ کرکے اس روحانیت میں جینا سیکھ لے جو اسے حیوانیت سے بلند کرتی ہے۔

مگر یہ کیفیت اگر مستقل رہے گی تو انسان کا امتحان ختم ہوجائے گا۔ کیونکہ نیکی میں مزہ اور گناہ سے نفرت اگر مستقل کیفیات ہوجائیں تو پھر اجر کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے یہ کیفیت رخصت ہوجاتی ہے۔

ایسے میں مخلص اور حساس لوگ پریشان ہوجاتے ہیں۔ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دھتکار دیے جانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ اسے اپنے کسی گناہ کا نتیجہ سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اکثر اوقات یہ کیفیت اللہ کے اسی طریقے کے مطابق ہوتی ہے جس کے مطابق وہ کائنات کا پورا نظام چلاتے ہیں۔ یعنی دن کے بعد رات بھی ہوتی ہے۔ بہار کے بعد خزاں بھی آتی ہے۔ نہ رات بری ہے نہ خزاں ہی بے فائدہ ہے۔ ہر ایک کی اپنی مصلحت ہے اور اس کیفیت کی مصلحت یہی ہے کہ انسان کا امتحان ہوجائے کہ وہ مزے کے لیے عبادت کرتا ہے یا خود پر جبر کر کے بھی عبادت کر سکتا ہے۔

اسی طرح اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ کیفیت انسان کے اندر پیدا ہونے والے تکبر کو دور کرتی ہے۔ ہر وقت یادِ الٰہی اور نیکی کی کیفیت بہر حال انسان کو یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ کوئی بہت بڑی ہستی بن چکا ہے۔ مگر ایسے میں دوری کے یہ لمحات اسے واپس ایک عام اور عاجز انسان ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اس احساس کی اللہ کے ہاں بڑی قدر و قیمت ہے اور اسی کیفیت کی وجہ سے انسان اللہ کے ہاں بہت مقبول ہوجاتا ہے۔

اس کیفیت کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے گزر کر ہی کوئی انسان معرفت اور قربِ الٰہی کی منزل کے قریب پہنچتا ہے۔ یہ گویا سفر کی تعبیر ہے جس میں خوش نما باغات بھی آتے ہیں اور لق و دق صحرا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ اس کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اپنے رب کی طرف سفر مسلسل جاری ہے اور بندہ اگر مایوس ہوئے بغیر عمل صالح کو خلاف طبیعت ہونے کے باجود جاری رکھے تو نہ صرف قربِ الٰہی کی کیفیات دوبارہ لوٹ آتی ہیں بلکہ انسان اس قابل ہوجاتا ہے کہ دوسروں کی تربیت اور رہنمائی بھی کر سکے۔ چنانچہ یہ کیفیت دراصل ایمان میں ترقی کی علامت ہے نہ کہ ایمان کے سلب ہوجانے کی کوئی نشانی۔

حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے

زمانہ قدیم کا انسان گاؤں دیہاتوں میں فطرت کے اندر جیتا تھا۔ اس کے ہر طرف پرندے چہچہاتے تھے۔ رنگ برنگے پھول کھلے ہوتے تھے۔ دور دور تک فصلیں لہلہاتیں تھیں۔ بارش ہوتی تو دور تک پھیلی زمین گل و گلزار ہو جاتی۔ جگہ جگہ سبزہ زار اور گلزار وجود میں آجاتے تھے۔ رات ہوتی یہ مناظر سمٹ جاتے مگر تاروں بھرا جگمگاتا آسمان انسان کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا۔ چاندنی راتیں ہوتیں تو آسمان چاند سے اور زمین چاندنی سے سج جاتی۔ پھر سورج تو ہر صبح و شام اپنے جلوے افق پر بکھیرتا رہتا اور نگاہیں انھیں سمیٹتی رہتیں تھیں۔

فطرت آج بھی وہی ہے، مگر اب کائنات کے بارے میں ہمارا علم بہت بڑھ چکا ہے۔ کائنات اور خود انسان کے بارے میں جو حیرت انگیز معلومات سامنے آئیں ہیں ان کا مطالعہ انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ معلومات اتنی حیرت انگیز اور تفصیلی ہیں کہ سارے درخت قلم اور سمندر سیاہی بن جائیں تب بھی یہ حیرت انگیز تفصیلات ختم نہ ہوں۔

فطرت کا مطالعہ اور سائنس کا علم ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ یہاں ہر جگہ آرٹس اور سائنس کے ہر شعبے کے شاہکار موجود ہیں۔ مصوری، موسیقی، انجینئرنگ، آرکیٹیکچر میتھس غرض ہر شعبہ علم کا ماہر جو آخری چیز تخلیق کر سکتا ہے، خدا اس سے کہیں بڑھ کر اعلیٰ چیزیں پہلے ہی بنا چکا ہے۔ ایک بندہ مومن جب یہ دیکھتا ہے تو تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ کتنا ہی قادر الکلام کیوں نہ ہو، اسے لگتا ہے ہر انسانی بیان خالق کائنات کی صفات و کمالات کو بیان کرنے میں آخری درجہ میں عاجز ہے۔ اپنی بے کسی پر اس کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور وہ یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے۔

کہہ دے گی سب کچھ ان کے ثنا خواں کی خامشی
چپ ہو رہا ہے کہہ کے میں کیا کیا کہوں تجھے

پالتو مرغی کا شکار

کسی ستم ظریف نے میاں بیوی کے رشتے میں مرد کی محبت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک شوہر کا اپنی بیوی سے اظہار محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے پالتو مرغی کا شکار کھیلنا۔ یہ بات مزاحیہ انداز میں مردوں کی ایک بڑی کمزوری کا بیان ہے۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ میاں بیوی کے رشتے میں بندھنے کے بعد بحیثیت عورت بیوی کی کشش کم ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت دفعہ اس کی ذمہ داری خواتین کے سر بھی ہوتی ہے جو بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی شوہر اور خود اپنی ذات سے بھی بے پروا ہو جاتی ہیں۔ گھر میں ماں آجاتی ہے اور بیوی رخصت ہو جاتی ہے۔ تاہم ایسا نہ ہو تب بھی مرد فطری طور پر بیوی میں بحیثیت عورت اس طرح دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ چیز اکثر میاں بیوی کے رشتے میں ناچاقی اور بعض اوقات گھر کی خرابی کا سبب بن جاتی ہے۔

ایسے میں یہ مردوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تکمیل لذت کے نہیں بلکہ تعارف لذت کے اصول پر بنائی ہے۔ اس دنیا کی ہر نعمت جیسے ہی دسترس میں آتی ہے، اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ یہ بظاہر اس دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہے لیکن اس واقعے کا اصل مقصد انسان کو یہ بتانا ہے کہ یہ دنیا سب کچھ پا لینے کی نہیں بلکہ اس جنت کے تعارف کی جگہ ہے جس کا ہر عیش دائمی اور ہر لذت ابدی ہو گی۔

یہ حقیقت جاننے کے بعد انسان کی اصل توجہ اس امتحان کی طرف رہے گی جس میں کامیابی کا نتیجہ یہ لافانی جنت ہو گی۔ ایسا انسان اپنی بیوی کی ڈھلتی جوانی کو واپس لانے یا کسی نئی عورت میں دلچسپی لینے کے بجائے اپنے بیوی سے جیسی کہ وہ ہے، محبت کرے گا۔ کیونکہ یہ محبت ہی گھر میں ایک پاکیزہ ماحول پیدا کرے گی۔ یہی پاکیزگی اس کو اور اس کے خاندان کو دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب و کامران کرے گی۔

اسلامی زندگی اور اسلامی نظام

قرآن مجید اپنے آغاز ہی میں سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کے شروع میں اپنا تعارف یہ کراتا ہے کہ وہ متقیوں اور انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہ بات مختلف اسالیب میں ان گنت مقامات پر دہرائی گئی ہے۔ قرآن مجید اپنی اس ہدایت کا نتیجہ دنیا کی اصلاح اور آخرت کی فلاح کی شکل میں بیان کرتا ہے۔ یعنی اس کی بات مان کر دنیا کے معاملات ٹھیک ہوجاتے ہیں اور انسانوں کو آخرت کی ابدی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

آخرت کا معاملہ تو قیامت کے دن ہی معلوم ہوگا لیکن دنیا کے بارے میں بڑی حد تک یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں اور اہل پاکستان کے اجتماعی معاملات کسی پہلو سے بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ جبکہ قرارداد مقاصد سے لے کر ختم نبوت کی آئینی ترمیم تک اور قصاص و دیت سے لے کر حدود تک، نماز صلوٰۃ سے لے کر نفاذِ زکوٰۃ تک، دستوری سطح پر تبلیغی تحریکوں سے لے کر جہادی تحریکوں تک، داڑھی سے لے کر پردے تک، مسجدوں سے لے کر مدارس تک اسلام کا جو غلغلہ اس ملک میں ستر برسوں سے مچا ہوا ہے اس کا کوئی عشر عشیر بھی دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کے نام پر اس درجہ ہنگامہ آرائی اور جدوجہد کے باوجود کیوں ہمارے انفرادی اور اجتماعی معاملات خراب ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ خدا کی نصرت کے بجائے ہم ہر جگہ ذلت و رسوائی، غربت و مہنگائی، بدامنی اور بداخلاقی کا دور دورہ دیکھ رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب قرآن مجید کی روشنی میں بالکل واضح ہے۔ قرآن مجید نے جس چیز کو ہدایت کہا اور جسے اسلامی زندگی کے عملی راستے کے طور پر ہمیں دکھایا، وہ ہماری مذہبی فکر میں بالکل غیر اہم ہو چکا ہے۔ اس لیے کہیں زیر بحث بھی نہیں آتا۔ قرآن مجید کے بتائے ہوئے اس راستے کو ہم نے قرآن کی آیات اور اسوہ حسنہ کی روشنی میں اپنی کتاب ''قرآن کا مطلوب

انسان'' میں جمع کر دیا ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی محبت اور بندگی کے جذبے سے سرشار ہو اور اپنے ہر تعصب اور عقیدت کو خدا کی مرضی کے سامنے ہیچ سمجھے۔انسان دوسرے انسانوں کے حوالے سے عائد ہونے والے فرائض اور ذمہ داریوں میں آخری درجہ میں حساس ہو اور لوگوں کے ساتھ احسان اور عدل کو زندگی بنالے۔ یہ منکرات اور فواحش سے بچ کر ایک پاکیزہ زندگی گزارنے کا نام ہے۔اور سب سے بڑھ کر انسان ان چیزوں کا ہدف اپنی ذات اور اپنے اخلاقی وجود کو بنائے نہ کہ دوسروں پر ٹھونسنے اور نافذ کرنے کی دھن میں لگا رہے۔

اس کے برعکس ہماری مروجہ مذہبی فکر کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس میں جو کچھ بھی دین ہے اس کا نشانہ ہمیشہ دوسروں کو بنایا جاتا ہے۔ ہر بولنے اور لکھنے والے کی انگلی دوسروں کی طرف اٹھی رہتی ہے۔اس فکر میں اپنے تعصّبات اور اپنے گروہ سے ہٹ کر حق کہیں نہیں پایا جاتا نہ اپنے دائرے سے باہر کسی سچائی کا ساتھ دینا جائز ہے۔اس فکر میں اسلام حکومتی اور دستوری سطح کے کچھ اقدامات کا یا اپنے ظاہر میں داڑھی، پردہ، پائنچے کو درست رکھنے اور عمامہ پہننے کا نام ہے۔

ستر برس میں ہم نے اس مروجہ اسلام کا آخری ممکنہ عروج دیکھ لیا ہے۔ ہمارا دستور جتنا اسلامی ہو چکا ہے، اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ جتنے مرد وخواتین داڑھی پردہ اختیار کر سکتے تھے کر چکے۔اب مغربی یلغار کے بعد ان کا تناسب معاشرے میں ہر حال میں کم ہوتا چلا جائے گا۔ جتنی لڑکیاں پردہ کریں گی اس سے دس گناہ زیادہ دوپٹہ اتاریں گی اور جتنے مرد باشرع داڑھی رکھیں گے اس سے دس گنا زیادہ لوگ داڑھیاں کٹوائیں گے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ ہمیں قرآن مجید کی بتائی ہوئی اسلامی زندگی پر عمل کرنا ہے یا اسلامی نظام کے اس تصور پر جو دستور اور فرد کے ظاہر کی تبدیلی کو ہدف بناتا ہے۔ہمیں خدا خوفی کے اس تصور کو اختیار کرنا ہے جو عدل واحسان کے نبوی ماڈل پر قائم ہے یا اسلام پسندی کے

اس ماڈل پر قائم رہنا ہے جو احتجاج اور نعرہ بازی کو اسلام سمجھتا ہے۔ ہمیں فلاح آخرت کا متلاشی وہ انسان چاہیے جو اپنے احتساب اور اپنی بہتری کی کوشش میں مشغول رہتا ہے یا پھر وہ جو دوسروں پر اسلام ٹھونسنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ہمیں انسانیت کے وہ ہمدرد چاہئیں جو پوری خیرخواہی سے ان کی اصلاح اور ہدایت کے خواہشمند ہوں یا وہ خدائی فوجدار چاہئیں جو انسانیت کو اپنوں اور غیروں کے خانے میں تقسیم کیے رکھیں۔ ہمیں وہ حکیم داعی چاہئیں جو گہری بصیرت کے ساتھ لوگوں کو دعوت دین دیں یا پھر وہ خدائی فوجدار چاہئیں جو اندھے راہ دکھانے والوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمیں فرقہ پرست دیندار چاہئیں یا پھر خدا پرست بندے چاہئیں جو رب کی مرضی کو اپنے تعصب اور خواہش پر غالب رکھیں۔

ہم نے ستر برس ایک تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم مزید تباہی سے پہلے قرآن مجید کے اصل پیغام کی طرف لپکیں۔ اگر ہم نے اس پیغام کو اختیار کر لیا تو پھر دنیا اور آخرت کی کامیابی ہمارا مقدر ہے۔ ورنہ اپنی تباہی سے ہم زیادہ دور نہیں رہ گئے۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

تعمیری کام اور تخریبی کام

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے جو دنیا بنائی ہے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک تعمیری دنیا ہے۔اس دنیا میں پہاڑ ہیں جو اگر ہلنے لگیں تو آبادیاں ختم ہوجائیں، مگر وہ صدیوں اپنی جگہ کھڑے رہ کر انسانوں کو موسم اور جنگلات عطا کرتے ہیں۔اس دنیا میں سمندر ہیں جو اگر ابل پڑیں تو شہروں کو ساتھ بہالے جائیں،مگراس کے بجائے وہ انسانوں کے سفر کے لیے اپنا سینہ مسخر کردیتے ہیں۔اس دنیا میں ہوا ہے جو بے قابو ہوجائے تو زندگی کی ہر رمق کو اڑا کر رکھ دے گی، مگر وہ زندگی کو تنفس جیسی لازمی چیز کی فراہمی سے آگے نہیں بڑھتی۔

خدا کی دنیا کا یہ مزاج اس وجہ سے بنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کچھ افراد کے لیے نہیں بلکہ تمام مخلوق کے لیے بنائی ہے۔تمام مخلوق کا فائدہ صرف تعمیری کام سے ہوتا ہے۔جبکہ تخریبی کام سے کچھ ہی لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے۔مثلاً زلزلہ،طوفان اور آندھی آنے سے بھی کچھ کاروباری لوگوں کی دولت اور بڑھ جاتی ہے،مگر بیشتر لوگوں کا بہت نقصان ہوجاتا ہے۔

انسانی معاشروں کا معاملہ بھی اس سے کچھ جدا نہیں۔یہاں بھی تعمیری کام سے سب لوگوں کا بھلا ہوتا ہے لیکن تخریبی کام سے کچھ لوگوں کا بھلا اور باقی کا نقصان ہوتا ہے۔اس کی ایک بڑی مثال جنگ ہے۔جنگ انسانی معاشروں کو برباد کردینے والی شے ہے۔یہ بچوں کو یتیم،عورتوں کو بیوہ اور آباد گھروں کو برباد کردینے والی شے ہے۔مگر کچھ لوگ جنگوں میں خوب دولت اور شہرت کماتے ہیں۔اس کے برعکس تعلیم ایک تعمیری عمل ہے۔اس سے تمام لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے۔

اگر ہمیں اپنے معاشرے کو بہتر بنانا ہے تو ہمیں تعمیری کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی اور تخریبی سوچ کی حوصلہ شکنی کرنا ہوگی۔ہم ایسا نہیں کریں گے تو کچھ لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا،مگر عام آدمی مسلسل نقصان اٹھاتا رہے گا۔

یہودی اور ہمارے ٹاک شو

مناظرہ ایک ایسا فن ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لیے بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ مناظرے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مخالف فریق کی مضبوط ترین دلیلوں کو بے معنی اعتراضات سے چٹکیوں میں اڑا دیا جائے۔ اس کی ایک نمایاں ترین مثال یہ ہے کہ قرآن مجید نے جب یہ چیلنج دیا کہ اس قرآن جیسی ایک صورت بھی بنالاؤ تو ہر گردن اس اعتراف میں جھک گئی کہ اس جیسا اعلیٰ کلام تخلیق کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

مگر یہود اس ناقابل شکست دلیل کا ایسا جواب لائے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انہوں نے چیلنج سے فرار اختیار کرتے ہوئے الٹا قرآن پر کمال عیاری کے ساتھ یہ اعتراض کر دیا کہ جس کلام میں مچھروں اور مکھیوں جیسی گھٹیا مخلوق کا ذکر ہو وہ اعلیٰ کیسے ہوسکتا ہے، گھٹیا تمثیل کوئی اعلیٰ مفہوم تو کیا کوئی بامعنی مفہوم ہی بیان نہیں کرسکتی۔ اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مناظرانہ سوچ کیا ہوتی ہے اور کس طرح الزامی طریقہ کار اور لفاظی پر مبنی اعتراض سے ناقابل تردید چیلنج کو بھی بظاہر ملیا میٹ کیا جاسکتا ہے۔ اس سے کچھ اور ہو نہ ہو اپنے لوگ ضرور مطمئن ہوجاتے ہیں۔

بدقسمتی سے آج کل کے ٹی وی شوز، پرنٹ اور سوشل میڈیا پر ہونے والے بحث و مناظرے میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ ان مباحثوں میں اسی طریقہ واردات کو استعمال کرکے ہر غلطی کا بھرپور دفاع کیا جاتا ہے۔ جیسے ہی کسی اخلاقی غلطی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے فوراً غیر متعلقہ نکتہ اٹھا کر اپنے جرم سے توجہ ہٹانے کے لیے ملبہ کسی اور پر گرادیا جاتا ہے۔ کسی کرپشن، دھاندلی، یا زیادتی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اعتراف کے بجائے فوراً ایک جوابی الزام لگادیا جاتا ہے۔ مگر ایسا کرنے والے ہشیار لوگوں کو شاید یاد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سطح پر اترنے والے یہود کے الزام کا جواب دینے کے بجائے ان کی جڑ کاٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ کاش لوگ یہ بات سمجھ لیں۔

حاجی صاحب کی رہنمائی

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (1818-1899) انیسویں صدی کے مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ ہندوستان میں دیوبندی مکتب فکر کی علمی، دعوتی اور متصوفانہ روایت جتنی کچھ بھی ہے، وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ حاجی صاحب ہی سے پھوٹی ہے۔ان کے وابستگان میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا یعقوب احمد نانوتوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا محمود الحسن مدنی جیسے دیوبندی اکابرین شامل ہیں۔

بیسویں صدی میں رونما ہونے والے انتہائی شدید دیوبندی بریلوی اختلافات کے باوجود جن میں مندرجہ بالا بعض دیوبندی اکابرین پر کفر اور پورے دیوبندی مکتب فکر پر گمراہی کے فتوے بھی بریلوی اہل علم کی طرف سے لگائے گئے، بریلوی حضرات کے ہاں حاجی صاحب کو بالعموم احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔بعض روایات کے مطابق پیر مہر علی شاہ جیسے بڑے بریلوی بزرگ بھی حاجی صاحب سے فیض یافتہ تھے اور انھی کی ہدایت پر حجاز مقدس سے واپس ہندوستان لوٹے تھے۔

حاجی صاحب کی ایک تصنیف ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' ان سات اہم مگر فروعی مسائل کے بارے میں ایک رہنما تحریر ہے جنھوں نے تقریباً ایک صدی سے برصغیر میں زبردست مسلکی انتشار و اختلاف پیدا کر رکھا ہے۔ان سات مسائل میں حاجی صاحب کی رائے ایک الگ موضوع ہے، مگر اس تحریر میں انھوں نے ایک ایسی بات بھی لکھی ہے جو ہر قسم کے اختلافات کو ختم نہ بھی کرے تب بھی ایک ایسے دائرے میں لے آتی ہے جہاں یہ باعث فساد نہیں رہتے۔

وہ اس تصنیف میں پہلے مسئلے یعنی مولود شریف کی بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

''عوام کو چاہیے کہ جس عالم کو متدین (دین دار) اور محقق سمجھیں اس کی تحقیق پر عمل کریں اور

دوسرے فریق کے لوگوں سے تعارض نہ کریں۔خصوصاً دوسرے فریق کے علما کی شان میں گستاخی کرنا، چھوٹا منہ اور بڑی بات کا مصداق ہے۔غیبت اور حسد سے اعمال حسنہ ضایع ہوتے ہیں۔ان امور سے پرہیز کریں اور تعصب و عداوت سے بچیں۔اور ایسے مضامین کی کتابیں اور رسالے مطالعہ نہ کیا کریں کہ یہ علما کا کام ہے۔عوام کو علما سے بدگمانی اور مسائل میں شبہ پیدا ہوتا ہے۔''

بلاشبہ یہ ایک انتہائی سچی بات ہے۔ ہمارا دین ایک محفوظ دین ہے۔ ہمارے دین کے بنیادی عقائد اور اعمال جتنے کچھ اللہ کے ہاں جوابدہی کا باعث ہوں گے وہ سب کے سب خاتم الانبیا علیہ السلام خود اپنی تعلیمات میں واضح طور پر بیان کر کے گئے ہیں۔لیکن اس کے باوجود علم کی دنیا میں جزئی اور فروعی چیزوں پر اہل علم میں اختلاف ہو جاتا ہے۔اہل علم میں اختلاف ہونا ایک فطری چیز ہے۔ وہ پہلے بھی ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔اس سے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

مسئلہ تب ہوتا ہے جب سطحی علم کے کچھ لوگ اور عوام الناس علمی معاملات میں کود پڑتے ہیں۔ایسے جہلا پورے اعتماد سے تنقیدیں لکھتے ہیں، پروپیگنڈے کرتے ہیں، الزام و بہتان کے تیر برساتے ہیں، کفر و ضلالت کے فیصلے کرتے ہیں حتیٰ کہ گالیوں اور بے ہودہ کلمات سے ہر اس شخص کو نوازتے ہیں جو ان کے نقطہ نظر سے مختلف رائے رکھتا ہو۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ علم و اخلاق کے ہر مسلمہ ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ان کا دل حسد ونفرت سے بھرا ہوتا ہے۔ ان کی زبان غیبت سے آلودہ ہوتی ہے۔ ان کا ذہن الزام و بہتان کی فیکٹری بن جاتا ہے، ان کا قلم جھوٹ اگلتا ہے۔مگر حال یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں میں دین حق کے ترجمان اور اسلام کی مدافعت کا نعرہ لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔یہی وہ صورتحال ہے جس نے آج ہمارے ہاں علمی و ذوقی اختلافات کو فرقہ وارانہ تعصّبات میں بدل دیا ہے۔

ایسے میں حاجی صاحب کی رہنمائی شاید وہ سب سے اہم چیز ہے جس کی آج دین کے نام پر کھڑے لوگوں کو سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔

دورِ قدیم اور دورِ جدید

انسانوں کی فکری تاریخ کو تین نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ماقبل از جدیدیت یا پری ماڈرن ازم (Pre Modernism) کا ہے۔ہم قارئین کی سہولت کے لیے اسے زمانہ قدیم کا نام دے دیتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے یہ ابتدا سے لے کر سترہویں صدی کے وسط تک کا دور ہے۔اس دور کی اصل خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں مذہب انسانی زندگی کا مرکزی خیال تھا۔ مذہب کی اساس وحی ہے۔لیکن تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا کہ انسان وحی کو محفوظ کر سکے ہوں۔ چنانچہ جیسے ہی انبیائے کرام دنیا سے رخصت ہوتے ،وحی میں تحریف ہو جاتی۔جس کے بعد توہم پرستی، ذاتی تخیلات اور انسانی اضافے مذہب کے نام پر لوگوں میں رائج ہو جاتے ہیں۔

اس صورتحال سے ایک استثنا خاتم النبیین علیہ السلام اور ان کے صحابہ کرام کا زمانہ ہے جب وحی کی حفاظت کا خدائی اہتمام کر دیا گیا۔تاہم مجموعی طور پر چونکہ اس دور میں ہر طرف توہم پرستی ہی کا دور دورہ تھا،اس لیے جیسے جیسے مسلمانوں کا فکری زوال بڑھا خود مسلم معاشرے توہم پرستی اور وحی سے عاری دینداری میں مبتلا ہو گئے۔ یوں اصل صورتحال میں کوئی بنیادی فرق نہیں آیا۔

پری موڈرن ازم میں چونکہ مذہب بنیادی قوت تھا اس لیے فطری طور پر مذہبی طبقات کو بہت طاقت حاصل تھی۔اس کی نمایاں ترین مثالیں مسیحیت میں چرچ کا ادارہ اور ہندومت میں برہمن کا کردار ہے۔سیاسی نظام زیادہ تر بادشاہت تھا،مگر بادشاہ بھی یعنی مصری حکمرانوں کی طرح خدا کے مظہر (god-kings) کی طرح حکومت کرتے یا مذہبی طبقات کو خوش کر کے خود کو سیاسی معاملات تک محدود رکھتے تھے۔

دورِ جدید کی آمد پر یہ صورتحال تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔توہم کی جگہ عقلیت نے لے لی۔اہل مذہب کی جگہ اہل دانش رہنما بن گئے۔ بادشاہت کی جگہ جمہوریت رائج ہوگئی۔ اس دور میں

خدا، مذہب، وحی اور آخرت جیسے تصورات کو ماضی کا بے فائدہ ورثہ سمجھ کر ترک کر دیا گیا۔ سائنسی ترقی نے انسانی دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ کائناتی طاقتیں جو اس سے قبل عبادت کا موضوع تھیں، انسان کی خدمت کے لیے مسخر کر لی گئیں۔ انسانی معاشرے سماجی علوم کی بنیاد پر ایک نئے قالب میں ڈھل گئے۔ فرد کی آزادی دور جدید کا سب سے بڑا خیر قرار پائی۔ غرض صنعتی دور کی ترقی اور اس کے تقاضوں نے زراعتی دور کے افکار، اقدار، روایات سب کو بدل کر رکھ دیا۔

دور جدید کا ظہور یورپ میں ہوا تھا۔ تاہم نئی طاقت کے نشے میں سرشار یورپی اقوام نے دو ایسے کام کر ڈالے جن سے دور جدید کی فکری اساسات پر انتہائی بنیادی سوالات پیدا ہو گئے۔ پہلا سرمایہ دارانہ نظام کا وہ ظالمانہ فروغ تھا جس نے ارتکاز دولت کے ذریعے سے خود یورپ کے معاشروں میں عام انسان کی زندگی جہنم بنا دی اور دوسرا بیسویں صدی میں ہونے والی دو عظیم جنگیں جن میں کروڑوں لوگ ہلاک ہوئے۔ ان واقعات نے عقلیت پر مبنی جدید فکر کی افادیت پر سوالات پیدا کر دیے۔ اس پر مستزاد بیسویں صدی کی ابتداء کی وہ سائنسی دریافتیں تھیں جنھوں نے اس خیال کی نفی کر دی کہ انسان سائنس کے ذریعے سے کائناتی حقائق تک مکمل رسائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یوں مادی نظام فکر کی سائنسی اساسات پر ایک کاری ضرب لگی جس کے نتیجے میں اس کا اعتماد مجروح ہو گیا۔

چنانچہ بیسویں صدی کے نصف آخر سے پوسٹ ماڈرن ازم کا فلسفہ وجود میں آیا جس نے علم اور عقلیت کے بجائے جذبات اور انسانیت کی بات کی اور قطعیت کے بجائے اضافیت، اور تحکم کے بجائے انفرادیت کو اپنا نعرہ بنایا۔ ان چیزوں کے نتیجے میں انسانی معاشروں میں مذہب کی اہمیت کو دوبارہ تسلیم کر لیا گیا۔ امن اور بقائے باہمی کی اہمیت نمایاں ہوئی۔ تاہم جس طرح ماڈرن ازم نے زمانہ قدیم کے تمام اہم تصورات کو بدل کر انسانی معاشروں کو مکمل طور پر تبدیل کیا

تھا پوسٹ ماڈرن ازم کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ یہ ایک ردعمل ہے جو ماڈرن ازم کی بعض کمزوریوں اور خرابیوں کو نمایاں کرتا ہے۔اسی لیے چند تبدیلیوں کے سوا مجموعی طور پر انسانی معاشرے آج بھی ماڈرن ازم کے اصولوں پر ہی کھڑے ہوئے ہیں اور یہ سمجھنا کہ عقلیت، سائنٹفک انداز فکر، آزادی، جمہوریت اور دور جدید کی دیگر اقدار رخصت ہو چکی ہیں، محض ایک غلط فہمی ہے۔ یہ دراصل میں ماڈرن ازم پر ایک تنقید ہے۔

اس بات کو سمجھنا اس پہلو سے بہت اہم ہے کہ ہمارے بعض فکری حلقوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ پوسٹ ماڈرن ازم میں مغربی افکار پر کی جانے والی تنقید کا مطلب عقلیت یا ماڈرن ازم کی شکست ہے۔ہم اپنے مضامین، اپنے فکری حلقوں میں ماڈرن ازم کی شکست پر شادیانے بجاتے رہیں گے اور دنیا ماڈرن ازم کی پیدا کردہ خرابیوں سے نجات پا لے گی، ایسا سمجھنا سوائے خوش فہمی کے اور کچھ نہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ماڈرن ازم کے افکار انفارمیشن ایج کے آغاز کے ساتھ مغرب سے آگے بڑھ کر مشرقی اقوام کو فتح کر رہے ہیں۔ عالمی سیاست کے افق پر نمودار ہونے والے تمام اہم کردار چاہے چین اور ہندوستان کی طرح ان کا تعلق مشرق سے ہو، دراصل ماڈرن ازم کی راہ کے مسافر ہیں۔

ایسے میں کرنے کا اصل فکری کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی اور قرآن مجید کی تعلیم کو بنیاد بنا کر از سر نو اسلامی تعلیمات کو پیش کرنا ہے۔ وحی نے زمانہ قدیم میں بھی انسانیت کو ظلم کی بھٹی سے نجات دلائی تھی اور دور جدید میں بھی وحی کو سمجھنے اور اس پر عمل میں نجات ہے۔ آج کرنے کا کام یہ ہے کہ ہمارے بہترین دماغوں کو نفرت کی نفسیات سے باہر نکال کر محبت الٰہی سے سرشار کرنا ہے۔ وحی اور صاحب وحی کی تعلیمات کو سمجھنے کی طرف لگانا ہے۔ آپ کی سیرت کو ان کی زندگی بنانا ہے۔ اس کے بغیر ظلم و استبداد نہ پہلے ختم ہوا ہے نہ اب ختم ہو گا۔

مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

خدااس دنیا کی سب سے با کمال ہستی ہے۔اس کے جمال وکمال کے نقشے اس کائنات میں ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔مگراس کے کمال کا سب سے بڑا جلوہ خود انسان کی اپنی ہستی ہے۔وہ انسان جسے الرحمٰن نے صفت بیان سے نوازا۔وہ جو ایک پھول کو دیکھ کر گلزار اور ایک مسکراتی نظر پر تلوار کا مضمون باندھ سکتا ہے۔وہ احساسات کی وادی میں جمالیات کے ایسے پھول کھلا سکتا ہے جن کی مہک سے ہر صاحب ذوق کی روح جھوم اٹھتی ہے۔

اس انسان پر خدا اگر احسان کر کے اپنی تعریف کا موقع دے دے تو یہ حاصلِ زیست ہے۔ غافلوں کو عہد بندگی یاد دلانا، غیر اللہ کی محبت کے نشے میں مست لوگوں کو مئے توحید کے جام پلانا، گمراہی کے اندھیرے میں ہدایت کی شمع جلانا، یہ وہ اعزاز ہے جس سے بڑا اعزاز کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

لوگ مال و دولت کے لیے جیتے ہیں۔نام و جاہ کے لیے مرتے ہیں۔قوم وملت کے لیے لڑتے ہیں۔فرقہ وتعصب کے لیے جھگڑتے ہیں۔حالانکہ جینے کا اگر کوئی مقصد ہے تو یہی ہے۔ یہ ہے تو فقیر بھی بادشاہ ہے اور نہیں ہے تو بادشاہ بھی فقیر ہے۔

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار
تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن مرے قاتل ، مرے احباب نثار

ایسے خدا میں جینا عجیب چیز ہے مگر ایسے خدا کو بھول کر جینا عجیب تر ہے۔

اختلاف اور انتشار

میرے مضامین پر لوگ بہت سے تبصرے کرتے ہیں۔ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں لوگ میرے خیالات سے اختلاف کرتے ہیں۔مثلاً کچھ عرصہ قبل ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے لکھے گئے ایک مضمون پر ایک صاحب نے مجھے ایک اختلافی ای میل بھیجا۔ان کے ای میل میں اٹھائے گئے نکات پر میرا اطمینان نہیں تھا لیکن اختلاف چونکہ ایک شائستہ انداز میں کیا گیا تھا اس لیے میں نے اپنے مضمون کے ساتھ سائٹ پر وہ اختلافی کمنٹ بھی شائع کر دیا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جس امتحان میں ڈالا ہے آزادی اس کی بنیادی اساس ہے۔اس آزادی کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے سے اتفاق اختلاف کرتے رہتے ہیں۔اس حوالے سے مکالمے کا سلسلہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔مسئلہ تب ہوتا ہے جب لوگ ایک دوسرے پر اپنی آرا اور خیالات ٹھونسنا شروع کر دیں۔ان کے جوابی دلائل سننے اور سمجھنے کے بجائے یکطرفہ طور پر اپنے موقف پر قائم رہیں۔دوسروں کی بات سمجھنے اور ان سے دلیل مانگنے کے بجائے اعتراض، الزام اور مہم جوئی کا طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ پروپیگنڈے کی مہمیں چلائی جائیں۔لوگوں کی نیت اور اخلاص پر ایسے گفتگو کی جائے جیسے وہ دل کا حال جانتے ہوں۔

یہی رویے معاشرے میں جمود اور انتشار پیدا کرتے ہیں۔جمود اس لیے کہ ایسی مہم بازی جھیلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ تخلیق کی نئی دنیا تعمیر کرنے والے حساس لوگ کونے میں دب کر بیٹھ جاتے ہیں۔انتشار اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ جہاں علمی اور فکری اختلاف پر اہل علم کی شخصیت، کردار اور اخلاص کو ہدف بنالیا جائے وہاں لوگوں کا ہر شخص پر سے اعتبار ختم ہونے لگتا ہے۔

اس لیے اختلاف رائے ضرور کیجیے مگر شائستگی کے ساتھ اور دوسرے شخص کو بھی حق دیجیے کہ وہ آپ کے ساتھ اختلاف کر سکے۔

اندھے راہ دکھانے والے

’’استاد! یہ فرمایئے کہ ہم مذہبی لوگوں کی اس قدر کوششوں کے باوجود بھی برائی کیوں بڑھے جارہی ہے؟‘‘ عارف کی مجلس میں آج یہ سوال ایک مذہبی طور پر فعال شخصیت نے اٹھایا تھا۔ عارف نے ایک نظر سائل کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا:

’’آپ کی سب سے بڑی دعا کیا ہے؟‘‘، ان صاحب نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر جواب دیا: ’’ساری دنیا سے برائی مٹ جائے۔ کل عالم میں اللہ کا دین غالب ہوجائے۔ ہمارے ملک میں اسلام نافذ ہوجائے۔‘‘

عارف نے سر جھکالیا۔ مجلس میں خاموشی چھاگئی۔ دیر تک جواب نہ آیا تو سائل نے پہلو بدلا۔ مگر وہ دور بیٹھے تھے۔ دیکھ نہ سکے کہ عارف کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے ہیں۔ خاموشی کی اس دبیز چادر کو آخرکار عارف کی آواز نے توڑ ڈالا۔

’’ہم مذہبی لوگوں کا نشانہ دوسرے ہوتے ہیں۔ مگر ہدایت بندوق کی گولی نہیں ہوتی جس سے دوسروں کو نشانہ بنایا جائے۔ یہ روشنی ہوتی ہے جو دل سے پھوٹتی ہے اور سب سے پہلے ہمارے اپنے وجود کو منور کرتی ہے۔ مگر ہم کبھی اس روشنی کو اپنے رب سے اپنے لیے نہیں مانگتے۔ کبھی رسمی طور پر مانگ لیا تو اپنی شخصیت اور عادات ایسی نہیں بناتے کہ اس روشنی کے مستحق ٹھہریں۔ ہم اپنے تعصّبات، گروہوں، نظریات اور تصورات کے اسیر ہوتے ہیں اور انھی کو دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ سو نہ ہم نے ہدایت پانے کو اپنا مقصد بنایا نہ خود کو ہدایت پانے کے قابل بنایا۔ ہم پیغمبر تو ہیں نہیں کہ اللہ پاک ہم پر ہدایت بن مانگے اتار دے۔ اس لیے ہمارے اندر اندھیرا رہتا ہے اور انھی اندھیروں کو ہم دوسروں میں بانٹتے ہیں۔

ہم اندھے راہ دکھانے والے ہیں۔ ہمیں سوال یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری کوششوں کے باوجود برائی کیوں ختم نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا اندھا پن کیسے دور ہوگا۔ کیونکہ جس روز یہ دور ہوگیا ہر جگہ ہدایت کی روشنی پھیل جائے گی۔‘‘

اخلاقی تحریک

کیپ ماؤنٹ کراچی کا سب سے زیادہ خوبصورت ساحل ہے۔ یہ ہاکس بے سے آگے کی سمت سب سے آخر میں آنے والا پکنک پوائنٹ ہے۔ یہاں کی اصل خوبصورتی یہ ہے کہ کچی سڑک پر سفر کرتے ہوئے آپ کو چاروں طرف ایک ہموار میدان ملے گا۔ مگر الٹے ہاتھ کی سمت آپ بمشکل سو دو سو میٹر چلیں گے تو اچانک معلوم ہوگا کہ آپ دراصل ایک ہموار پہاڑ کی سطح مرتفع پر کھڑے ہیں اور اس پہاڑ سے نیچے دور دور تک سبزی مائل نیلگوں پانی آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان مہیا کررہا ہے۔ خاص کر شام کے وقت ڈھلتے ہوئے سورج کی مدھم ہوتی روشنی میں یہ منظر اتنا دلکش ہوتا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔

اس پہاڑی میدان سے نیچے اترنے کے کئی قدرتی راستے ہیں جن کے ذریعے سے لوگ کراچی کے اس سب سے زیادہ صاف ستھرے اور ہموار ساحل تک پہنچتے اور اپنے گھر والوں اور دوسروں کے ہمراہ پتھروں سے محفوظ اس صاف ستھرے اور ریتیلے ساحل پر سمندر کی ہموار موجوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

تاہم یہ ماضی کی باتیں ہیں۔ یہ اس وقت کی کہانی ہے جب انسان کی جان، مال اور عزت و آبرو اس ملک میں اتنی ارزاں نہیں ہوئی تھی جتنی آج کل ہے۔ اُسی زمانے کا یہ قصہ ہے کہ کچھ لوگ کیپ ماؤنٹ پر پکنک منانے گئے۔ ایک نوجوان لڑکی ساحل سے کچھ دور پہاڑ کے سائے کے نیچے ستانے بیٹھی تو ہوا کی پیہم یلغار سے بوسیدہ ہوجانے والی ایک پہاڑی چٹان اپنی جگہ سے الگ ہوئی اور سیدھی نیچے بیٹھی اس لڑکی پر جا گری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکی کے جسم کے کئی ٹکڑے ہوگئے۔ دھڑ کہیں، ٹانگیں کہیں اور ہاتھ کہیں اور جا گرے۔

اخبارات میں یہ واقعہ بھی شائع ہوا اور اس لڑکی کی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی لاش کی تصویر بھی شائع

ہوئی۔ میں نے جب یہ تصویر دیکھی تو مجھے خیال آیا کہ کائناتی طاقتیں مادی قوانین پر عمل کرتی ہیں۔ یہ قوانین بالکل اندھے ہوتے ہیں۔ یہ جب روبہ عمل ہوتے ہیں تو انھیں اس کی کوئی پروانہیں ہوتی کہ کسی کی جان جارہی ہے یا کسی کی دنیا برباد ہورہی ہے۔ یہی مادی دنیا کا اصول ہے۔

تاہم انسانی دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک مادی دنیا میں پیدا کرکے اخلاقی حس بھی عطا کی ہے۔ انسان اپنے ہر عمل کو اس اخلاقی حس کی روشنی میں جانچ کر قدم اٹھاتا ہے۔ وہ کیپ ماؤنٹ کی چٹان کبھی نہیں بن سکتا جو اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے یہ نہ سوچے کہ اس کے نتیجے میں کسی کی جان چلی جائے گی۔ یہ اخلاقی حس نہ ہو تو انسان کو اختیار کی جو طاقت اور عقل کی جو استعداد دی گئی ہے وہ اتنی خوفناک ہے کہ انسان اس دنیا کو برباد کرکے رکھ سکتا ہے۔ یہ اخلاقی حس زندہ نہ ہو تو دنیا کا کوئی قانون کوئی ضابطہ انسان کی اس تباہ کن صلاحیت کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔

بدقسمتی سے دورِ جدید کے ہمارے مصلحین اس حقیقت سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ انسان کے اخلاقی وجود کو طاقتور بنائے بغیر معاشرے کو درست نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف قانون کی طاقت سے معاملات کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات ہر پہلو سے ایک غلط بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاشروں کی اصلاح اور ان میں بہتری اس وقت آتی ہے جب تعلیم اور تربیت کے ذریعے سے لوگوں کی اخلاقی حس کو پوری طرح زندہ کردیا جائے۔ جان، مال عزت و آبرو کے تحفظ کا سبق ان کی گھٹی میں ڈال دیا جائے۔ عدل، احسان، ہمدردی کے اعلیٰ انسانی جذبات کی قدر و قیمت ان کی نظر میں نمایاں کردی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک اخلاقی تحریک چلائی جائے۔ اس اخلاقی تحریک کے بغیر ماضی میں کبھی کسی معاشرے کی اصلاح ہوئی ہے نہ مستقبل میں اس کا کوئی امکان ہے۔ اس کے بغیر ہمارے ظلم کرنے والے بدل سکتے ہیں۔ معاشرے سے ظلم و بربریت کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

ظفر اور انجم

ظفر ایک اوسط ذہانت کا حامل نوجوان تھا۔ وہ ایک مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اوسط درجے کے تعلیمی اداروں سے تعلیم دلوائی۔ اس کے ماں باپ میں البتہ ایک خوبی کمال کی تھی۔ انھوں نے ظفر کی تربیت کو مسئلہ بنالیا تھا۔ خاص کر دو عادتوں کو انھوں نے ظفر میں بہت پختہ کردیا تھا۔ ایک یہ کہ زندگی کے ہر واقعے کو مثبت انداز سے دیکھنا ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی میں ہر ترقی اور کامیابی محنت، مستقل مزاجی اور سخت جدوجہد کے بعد ملا کرتی ہے۔

ظفر ابھی زیرِ تعلیم تھا کہ اس کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس کی ماں نے اس سے کہا۔ بیٹا یہ بظاہر ایک مسئلہ لگ رہا ہے مگر درحقیقت یہ ایک موقع ہے۔ قدرت نے تمھیں ایک موقع دیا ہے کہ تم وقت سے پہلے پختگی کو پہنچ جاؤ۔ تم اپنی پختگی کی بنیاد پر کم وقت میں زیادہ اور دیر تک رہنے والی ترقی حاصل کرو۔ ظفر نے ماں کی بات گرہ سے باندھ لی۔ تعلیم کے ساتھ ٹیوشن پڑھانا شروع کردی۔ کچھ عرصے بعد ایک پارٹ ٹائم جاب شروع کردی۔ کئی برس اسی طرح گزرے۔ تعلیم ختم ہوئی تو جب اس کے دوسرے دوست ملازمتیں ڈھونڈ رہے تھے وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر ایک بہت بہتر ملازمت حاصل کر چکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد دوران ملازمت اس نے شام کے اوقات میں مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اور کچھ ہی عرصے میں ایک اور کمپنی میں اعلیٰ مینجمنٹ کی سطح کی ملازمت حاصل کرلی۔

کچھ ہی عرصے میں اس کی والدہ نے اس کی شادی بہت اچھی جگہ کردی۔ مگر اس کی بیوی انجم کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جہاں بچوں کو بہت اعلیٰ تعلیم دلوائی گئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی بچوں کی pampering کرنا، ان کے ناز و نخرے اٹھانا پرورش کا حصہ تھا۔ چنانچہ انجم کی توجہ ہمیشہ اسی بات پر رہتی تھی کہ اس کے پاس کیا نہیں ہے اور دوسروں کے پاس کیا ہے۔ چنانچہ جلد

ہی مطالبات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسے اپنی ساس کا وجود بھی بوجھ لگتا تھا۔ ظفر نے ابتدا میں کچھ مزاحمت کی تو جھگڑے شروع ہوگئے۔ اب یا تو ظفر ہمیشہ کے لیے ہتھیار ڈال دیتا یا پھر بیوی کے رنگ میں رنگ جاتا۔

ایسے میں اس کی ماں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا: بیٹا زندگی نے تمھیں ایک اور موقع دیا ہے۔ اس سے پہلے تم نے حالات کو شکست دے کر فتح پانا سیکھی تھی۔ اب انسانوں کو جیت کر زندگی میں ایک اور فتح حاصل کرو۔ یہ جنگ جیت لو گے تو تمھاری اولاد بہت اچھی انسان بنے گی۔ قدرت نے تمھیں موقع دیا ہے کہ تم معاشرے کو اعلیٰ انسان فراہم کرو۔

ماں کی بات ظفر کے دل پر اثر کرگئی۔ گرچہ اس کے لیے یہ صورتحال بہت نازک تھی، مگر اس نے حکمت سے اس معاملے سے نمٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے فوری طور پر جھگڑوں سے بچنے کے لیے بیوی کی ہر بات کو منع کرنے کے بجائے کچھ قابل قبول مطالبات پورے کردیے۔ ساتھ ہی اس نے غور کیا تو اسے معلوم ہوگیا کہ اس صورتحال کا سبب انجم کی تربیت اور اس کا خاندان ہے۔ انجم کے خاندان میں صورتحال یہ تھی کہ اس کے تین بھائی تھے۔ تینوں خوشحال تھے۔ مگر خوش نہیں تھے۔ تینوں کی بیویاں بھی انھی کے مزاج کی تھیں۔ ان میں آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ مقابلے بازی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ہر کوئی ماں باپ سے فائدے اٹھانا چاہتا تھا مگر ذمہ داری اٹھانے کو کوئی تیار نہ تھا۔

اسے اندازہ ہوگیا کہ میکے کی میراث سے جان چھڑائے بغیر انجم کی اصلاح بہت مشکل ہے۔ مگر ظفر جلد باز نہیں تھا۔ وہ بیوی کو توجہ دلانے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا رہا کہ اس کی بیوی اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے، اس کے لیے عذاب نہ بنے۔

کچھ ہی عرصے بعد ظفر کی ساس بیمار ہوگئیں۔مگر ان کے ہر بیٹے اور بہو نے ذمہ داری اٹھانے کے بجائے دوسرے کے سر ڈالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔یوں بڑھاپے میں ان کی مٹی پلید ہوگئی۔ایسے میں ظفر انجم سے کہہ کر اپنی ساس کو اپنے گھر لے آیا۔انجم تو خیر بیٹی تھی، مگر ظفر نے بھی بیٹے سے بڑھ کر ہر طرح جان و مال سے ان کا خیال کیا۔ان پر بے دریغ پیسہ خرچ کیا۔یہی وہ لمحہ تھا جب انجم نے اپنے شوہر کو خواہشات پوری کرنے والی مشین کے بجائے ایک اعلیٰ انسان کے روپ میں دریافت کیا۔

ظفر نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انجم کو سمجھانا شروع کیا کہ اصل خرابی انجم کے اندازِ فکر میں تھی جو اپنی ساس کو بوجھ سمجھتی تھی۔کسی بزرگ کی خدمت کرنا تو عظیم نعمت ہوتا ہے۔اسی طرح اس نے واضح کیا کہ وہ انجم کی خواہشات پر پیسہ لٹاتا رہتا تو اس کی والدہ کی مالی مدد نہیں کی جاسکتی تھی۔اس نے انجم کو یہ بھی سمجھایا کہ اس کے بھائیوں کے غلط رویے کی اصل وجہ مادی اندازِ فکر ہے جس میں چیزوں کو انسانوں سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

انجم نے اس عرصے میں اپنے بھائیوں کا جو رویہ دیکھا تھا اس آئینے میں اسے اپنا، اپنے بھائیوں اور اپنے شوہر کا فرق واضح طور پر نظر آ گیا تھا۔اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اگر وہ اسی راستے پر چلی تو اس کی اولاد اس کے ساتھ وہی کرے گی جو اس کے بھائیوں نے اس کی ماں کے ساتھ کیا تھا۔اور اگر وہ اپنے شوہر کی راہ پر چلی تو اس کی اولاد اس کے شوہر جیسی ہوگی۔انجم نے فیصلہ کرلیا۔اسے اپنی اولاد کو اپنے شوہر جیسا بنانا ہے۔

اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر سے سابقہ رویے کی معافی مانگی۔اپنے گھر کو ایک پرسکون جنت بنادیا۔اللہ نے کچھ ہی عرصے میں اس کی گود بھر دی۔اب انجم اپنی ساس کی طرح ایک اور اعلیٰ انسان کی پرورش کر رہی ہے جو آگے چل کر معاشرے میں نجانے کتنی خیر اور برکت پھیلائے گا۔

نقطہ نظر

کہتے ہیں کہ ایک تصویر ہزار الفاظ بول سکتی ہے۔ لیکن یہ تصویر کی نہیں انسانی آنکھ کی خوبی کا بیان ہے جو خارجی دنیا کو سمجھنے اور جاننے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ تاہم آنکھوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس میں کئی محدودیتیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً انسانی آنکھ اپنے سامنے موجود منظر کا مکمل طور پر احاطہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن انسانی ذہن گہرے طور پر اور جزئیات میں جا کر صرف عین نظر کے سامنے والی چیز جس پر انسان کا فوکس ہوتا ہے، اسی کو سمجھتا ہے۔ باقی چیزیں نظر آنے کے باوجود انسان دیکھ نہیں پاتا۔

اس بات کو ٹی وی سے باآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ کسی نیوز چینل پر چلتی ہوئی خبروں کی پٹی کو پڑھنا شروع کر دیں۔ یہ کرتے وقت آپ کی نظر میں ٹی وی اسکرین بلکہ اردگرد کی دیوار یا الماری بھی ہوگی۔ مگر خبروں کی پٹی کو پڑھتے وقت آپ کو یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ اس وقت اسکرین پر کیا مناظر بدل رہے تھے۔ ان مناظر کو دیکھنے کے لیے آپ کو نظروں کا فوکس ان کی طرف کرنا ہوگا۔ غرض آپ دنیا کے کسی بھی منظر پر نظر ڈالیں آپ کو بہت کچھ نظر آئے گا لیکن ذہن قبول صرف اسی کو کرتا ہے جسے نظریں گاڑھ کر پوری توجہ سے دیکھا جائے۔ یہیں سے ہماری زبانوں میں نقطہ نظر یا پوائنٹ آف ویو کے الفاظ داخل ہوئے ہیں۔ یعنی وہ فکر جو ہماری نگاہ کا مرکز ہو۔

انسان اس دنیا میں جس آزمائش میں ہے اس میں سب سے بنیادی چیز صحیح نقطہ نظر کو دریافت کرنا ہے۔ اس امتحان میں عمل کی حیثیت ثانوی ہے۔ اگر نقطہ نظر غلط ہے تو زیادہ عمل بھی کچھ نہیں اور نقطہ نظر درست ہے تو تھوڑا عمل بھی نجات کے لیے کافی ہے۔

تاہم صحیح نقطہ نظر کو دریافت کرنے کی اس آزمائش میں اصل مصیبت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں شعور کی عمر میں پہنچنے کے بعد نہیں بھیجا جاتا بلکہ ایک بے سمجھ بچے کے طور پر جنم لیتا ہے اور بڑا

ہونے سے قبل اس کے والدین اور قریبی ماحول اس کا ایک نقطہ نظر بنا چکے ہوتے ہیں۔ وہ کسی خاص عقیدے یا نظریے کو اس کی نگاہوں کا مرکزی خیال بنا چکے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کا شروع میں کوئی خاص نظریہ نہیں ہوتا لیکن کچھ دینی ذوق کی بنا پر وہ کسی گروہ، جماعت یا فرقے میں شامل ہوجاتا ہے اور وہاں یکطرفہ باتیں سنا سنا کر کوئی خاص نقطہ نظر اس کے ذہن کا مرکزی خیال بنا دیا جاتا ہے۔

اب یوں نہیں ہوتا کہ دنیا میں دوسرا کوئی نقطہ نظر پایا نہیں جاتا۔ سب موجود ہوتے ہیں اور انسان کو نظر بھی آرہے ہوتے ہیں، مگر ٹی وی کی پٹی کی طرح چونکہ اس کا ذہن ایک خاص چیز ہی میں دلچسپی رکھتا ہے، اس لیے وہ خبریں ہی پڑھتا ہے اور باقی چیزیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ کوئی دوسرا توجہ دلائے تو وہ اسے غلط اور گمراہ کہتا ہے۔ کبھی وہ دوسری حقیقت کو درست سمجھنا بھی شروع کر دے تو اس کا ابتدائی ماحول زبردست مزاحمت کرتا ہے۔ وہ طرح طرح کے نکتے اٹھا کر اس کے تعصب کو بھڑکاتا ہے اور یوں انسان سچائی کو سامنے پا کر بھی اسے دیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

اس محرومی سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ اس حقیقت کو جان لینا ہے کہ انسان اس دنیا میں حالت امتحان میں ہے۔ اس امتحان میں ناکامی کا نتیجہ جہنم کی آگ ہے۔ یہ امتحان عمل سے پہلے صحیح نقطہ نظر دریافت کرنے کا امتحان ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان نظریں اپنے موجودہ نقطہ نظر سے ہٹائے، دوسرے حقائق غور سے دیکھے اور انھیں سمجھے۔ پھر تقابل کر کے دیکھے کہ سچائی کہاں ہے۔ جو انسان یہ نہیں کرے گا وہ گمراہی کا شدید خطرہ مول لے رہا ہے۔ وہ تعصب کا شکار ہوجائے گا۔ وہ ساری زندگی کنفیوژ ہو کر اس عزم سے محروم رہے گا جو عمل پر ابھارتا ہے۔ یا پھر پہلے خود گمراہ ہوگا اور پھر دوسرے کی گمراہی کا وبال لا دے روز قیامت ایک مجرم کے طور پر پیش ہوگا۔

محبت سے غفلت

رومانویت دنیا کی ہر زبان اور ہر قوم کی شاعری کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ شاعری وجود ہی میں اس لیے آتی ہے کہ اپنے محبوب کے محاسن کو بیان کیا جائے اور اپنی محبت کا نذرانہ اس کے حضور پیش کیا جاسکے۔ یہ رومانوی شاعری محبت کے اس جذبے سے وجود میں آتی ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ محبت کا یہ اظہار صرف صنف مخالف ہی کے لیے ظہور نہیں کرتا بلکہ اولاد کے لیے بے انتہا شفقت، والدین کی خدمت، بزرگوں کی عقیدت اور دوست احباب کی رفاقت کے ان گنت رنگوں سے زندگی کو سجا تا رہتا ہے۔

تاہم یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اپنے خالق و مالک اور پروردگار کے معاملے میں یوں لگتا ہے کہ اکثر انسان اس جذبے سے واقف ہی نہیں۔ محبت میں انسان کسی کے جمال کی تعریف میں الفاظ کے تاج محل تخلیق کرتا ہے، مگر خدا کی زندہ و جاوید حمد تو دور کی بات ہے اس کی ہر نعمت کے مزے لوٹنے والے اس کا شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ محبت کسی کی یاد میں تڑپنے اور بے قرار رہنے کا نام ہے، یہاں حال یہ ہے کہ عین نماز میں خدا یاد نہیں رہتا۔

محبت کسی کے لیے اپنا دل اور اپنی جان نذر کر دینے کا مطالبہ کرتی ہے، مگر ہم میں سے کسی نے شاید ہی کبھی دو جملے بول کر اللہ تعالیٰ کو یقین دلایا ہو کہ میرا جینا اور مرنا آپ کے لیے ہے۔ محبت قربانی اور وفا کا تقاضا کرتی ہے، ہم فجر میں اٹھنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ محبت اپنی ہستی اور اپنی انا کو فنا کر دینے کا نام ہے، مگر ہم خدا کے بجائے اپنی انانیت ،فرقہ اور تعصّبات کا جھنڈا بلند کرنا دینداری سمجھتے ہیں۔

آہ !اس کائنات میں انسان واحد ہستی ہے جو خدا سے محبت کرنے اور اظہار محبت کے ہر طریقے پر قدرت رکھتا ہے۔ مگر آہ کہ انسان ہی اس محبت سے سب سے بڑھ کر غافل ہے۔

علم نافع

احادیث کے نام سے جو ذخیرہ اس وقت مسلمانوں کے پاس موجود ہے اس میں غالباً سب سے زیادہ قیمتی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہیں۔ امام مسلم نے ایسی ہی ایک بے مثال دعا اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔ اس دعا کا ایک جز درج ذیل ہے:

اللهم انی اعوذبك من علم لا ینفع

''اے اللہ میں اس علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو فائدہ مند نہ ہو''۔ (مسلم: رقم 2722)

علم کئی پہلوؤں سے غیر نافع ہوسکتا ہے۔ مگر ان میں سب سے زیادہ تباہ کن پہلو یہ ہے کہ انسان علم حاصل کرے اور یہ علم اس کی شخصیت میں کوئی ارتقا پیدا نہ کرے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک بچہ خوراک کھائے مگر یہ غذا جزو بدن نہ بنے اور بچے کی نشوونمارک جائے۔ جس کے بعد والدین فوراً بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔ ڈاکٹر پہلے مرحلے پر بچے کے نظام ہاضمہ کا جائزہ لے کر یہ دیکھے گا کہ غذا ہضم کیوں نہیں ہو رہی۔ کیونکہ یہی مسئلے کی جڑ ہے۔

علم کا معاملہ بھی مختلف نہیں۔ علم بلاواسطہ یا بالواسطہ شخصیت کو بہتر بناتا ہے۔ مگر یہ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو غوروفکر کی صلاحیت استعمال کر کے اس علم کو ہضم کریں اور اسے قیمتی اسباق میں تبدیل کریں۔ جبکہ دوسرے لوگوں کو یا تو علم کا قبض یا پھر علمی اسہال ہو جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ جو پڑھتے سنتے ہیں وہ ان کے دماغ تک محدود رہتا ہے۔ یہ علمی قبض علم کو شخصیت تک منتقل نہیں ہونے دیتا۔ جبکہ علمی اسہال میں انسان جو سیکھتا ہے منہ کے راستے دوسروں پر خارج کر دیتا ہے، خود کچھ نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی شخصیت میں بھی ارتقا نہیں ہو پاتا۔

علم نافع دراصل علم کو اسباق میں بدلنے اور اپنی فکر اور شخصیت کو اس کے مطابق ڈھالنے کا نام ہے۔ ورنہ کتنی ہی کتابیں پڑھ لی جائیں اور کتنے ہی لیکچر سن لیے جائیں، سب بے کار ہیں۔

میرے شوق کی بلندی میرے حوصلے کی پستی

میں ایک مسلمان ہوں۔ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا۔ اسلام میرا نسلی مذہب ہے اور اسی لیے جنت میرا مقدر ہے۔ مگر میرا یہ اعتماد بلا وجہ نہیں۔ میں اسلام کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو بے نقاب کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ہر فتنے سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے سرگرم رہتا ہوں۔ ہاں عدل، احسان، انفاق کرنے اور فواحش، منکرات اور ظلم و زیادتی سے روکنے والی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا مجھے ذرا مشکل لگتا ہے۔ لیکن الحمدللہ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

مجھے پیغمبر اسلام علیہ السلام سے والہانہ عشق ہے۔ درود وسلام کے بغیر میں اپنے آقا کا ذکر نہیں کر سکتا۔ مگر قربانی، ایثار، صبر اور درگزر پر مبنی آپ کے اخلاق عالیہ مجھے پہاڑ کی وہ چوٹی محسوس ہوتے ہیں جس پر چڑھنا بہت مشکل ہے۔ بھلا بتائیے پہاڑ پر چڑھنا بھی کوئی کرنے کا کام ہے۔ ویسے بھی جنت صراط مستقیم پر چلنے سے ملتی ہے، پہاڑ پر چڑھنے سے نہیں۔

مجھے اللہ پر کامل ایمان ہے۔ اتنا ایمان کہ میں مشرکانہ سوچ رکھنے والے ہر شخص کو جہنمی سمجھتا ہوں۔ مگر اس کی یاد اور اس کا شوق، اس کے بندوں پر رحم اور ان سے ہمدردی مجھے کرنے کا کوئی کام نہیں لگتا۔ مجھے یقین ہے کہ دین اسلام کا پیغام ساری دنیا کے لیے ہے۔ انسانیت کے پاس اسلام کے سوا سچائی کو پانے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ مگر دعوت دین کا کام مجھے ایک پتھریلا راستہ محسوس ہوتا ہے۔ خود سوچیے کہ پتھروں پر چلنا بھی کوئی معقول طریقہ ہے۔

کل مجھے ایک پرانا دوست ملا۔ اس کے خیالات بالکل میرے جیسے تھے۔ مگر وہ بہت دکھی تھا۔ میں نے غم کا سبب پوچھا تو یہ شعر سنا کر چلا گیا:

غمِ زندگی کا حسرتؔ سبب اور کیا بتاؤں
میرے شوق کی بلندی میرے حوصلے کی پستی

دوسروں کا گند

ٹیکسی ڈرائیور کی زبان سے نکلی ہوئی گالی اتنی غلیظ تھی کہ کانوں سے دماغ تک جانے والی ہر رگ مجھے آلودہ ہوتی محسوس ہوئی۔ غلطی سامنے والے کی تھی، اس ٹیکسی والے کی نہیں جس میں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے تنبیہ کی تو وہ ایک گالی دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جواب میں ٹیکسی ڈرائیور نے جو کچھ کہا وہ کوئی قلم رقم کرنا چاہے گا نہ کوئی کان اسے سننا چاہے گا۔

تاہم ڈرائیور کو احساس ہو گیا کہ گاڑی میں کوئی اور بھی ہے۔ وہ اپنی زبان کے گند کو تاویل کی جھاڑو سے صاف کرنے لگا۔ وہ مجھے سمجھانے لگا کہ سامنے والے کی کیا غلطی تھی۔ اور یہ کہ آج کل سب لوگ ایسے ہی غلطی کر کے دوسروں کو غلط کہتے ہیں۔ اس نے کچھ وقفہ لیا تو میں نے پوچھا:

''کوئی آدمی اگر راستے میں بیٹھ کر فضلات خارج کرنے لگے تو کیا تم اسے اپنے منہ میں ڈالو گے یا اپنے کپڑوں سے پونچھو گے۔'' میرا سوال بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ سٹپٹا کر بولا:

''وہ الگ بات ہے۔ اِس نے تو......'' میں نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''الگ بات صرف یہ تھی کہ اس نے اپنا گند منہ سے نکالا تھا۔ مگر تم نے اس گند کو اپنے منہ میں ڈال لیا۔ تم سمجھتے ہو کہ تم نے غصہ اتار دیا۔ مگر جو گند تم نے اپنی زبان سے ذہن تک پہنچایا ہے وہ کیسے صاف ہوگا؟''

ٹیکسی ڈرائیور شاید ٹی وی کے ٹاک شو نہیں دیکھتا تھا جہاں اپنی ہر غلطی کو درست ثابت کرنا اہل صحافت اور اہل سیاست کے فن کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ وہ خاموشی سے بولا:

''بس غصہ آ گیا۔ مگر آپ ٹھیک بولتا ہے۔ گندے آدمی کی بات کا کیا جواب دینا۔''

میں نے سوچا کہ کاش ہم یہ سبق سیکھ لیں کہ کسی کے گند سے خود کو گندا کرنا حماقت ہے۔ مگر شاید اس کے لیے صبر کی جو صلاحیت چاہیے وہ ہم میں بہت کم ہے۔

ولن کی تلاش

منفی سوچ کے لوگ زندگی بھر کسی نہ کسی ولن کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ وہ ولن ہوتا ہے جس پر وہ اپنی ہر ناکامی اور ہر شکست کا ملبہ ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس مزاج کے لوگ جب کسی قوم کے سر پر لیڈر بن کر مسلط ہو جائیں تو پھر وہ پوری قوم کو ولن کی تلاش میں لگا دیتے ہیں۔ اس کے بعد قوم کے ہر مسئلے اور پریشانی کا سبب کوئی اور قوم یا گروہ بن جاتا ہے جس کا کام صرف سازشیں کرنا اور انھیں نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دنیا میں ولن نہیں پائے جاتے۔ بلاشبہ اس دنیا میں ولن اور دشمن پائے جاتے ہیں مگر انھیں کامیابی ان کی کوششوں سے زیادہ ہماری کمزوریوں کی بنا پر ملتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال شیطان ہے۔ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔ مگر اس کے باجود قرآن کریم جگہ جگہ واضح کرتا ہے کہ اسے اختیار صرف انھیں لوگوں پر حاصل ہوتا ہے جو اپنی باگ اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جو نفسانی خواہشات کی پیروی، تکبر اور تعصب جیسے اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہی معاملہ ان افراد اور اقوام کا ہے جو ہمارے اطراف میں رہ کر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ ان کی کوششیں نہیں جو انھیں کامیاب کرتی ہیں بلکہ ہماری حماقتیں اور کمزوریاں ہیں جو ہمیں نامراد کرتی ہیں۔ اس لیے عقلمند وہ ہے جس کی ساری توجہ کسی ولن کو تلاش کر کے اس پر الزام ڈالنے کے بجائے اپنی کمزوریوں کو تلاش کر کے انھیں دور کرنے پر مرکوز رہے۔ رہے ولن ڈھونڈنے والے تو بربادی کے سوا ان کا مقدر اور کچھ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دنیا میں ولن تلاش کرنا ہی ایک جرم ہے۔ یہ اپنی شکست آپ تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ جس کے بعد زندگی کبھی آپ کے لیے ترقی کی راہ نہیں کھولے گی۔

کنفیوژن کا انجام

قرآن مجید میں جگہ جگہ کفار کی ایک صفت ''مریب'' کے عنوان سے بیان کی گئی ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ مبتلائے شک کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن مجید نے تقریباً ہر جگہ اس لفظ کو ''شک'' کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ جس کے بعد ''مریب'' کا مفہوم وہی بن جاتا ہے جسے آج کل کنفیوژن کہا جاتا ہے۔ یہ کنفیوژن یا الجھن انسان کو سچائی کو قبول کرنے سے روک دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے ''مریب'' شخص کا انجام قرآن مجید کے مطابق جہنم ہے (ق 25:50)۔ ساتھ میں قرآن مجید اپنے آغاز میں یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ اس کے باوجود قرآن کے مخاطبین شک اور کنفیوژن میں پڑے رہے یہاں تک کہ جہنم میں جا پہنچے۔

انسان کے کنفیوژن کی بنا پر اس انجام کو پہنچنے کا سبب ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان واضح ترین حقائق کو اپنے تعصّبات کی بنا پر ماننا نہیں چاہتا۔ مگر وہ حقائق ایسے صریح ہوتے ہیں کہ انسان انکار بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انسان گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر جیسا کہ سورہ ق کی آیت سے واضح ہے اس گومگو کو اللہ تعالیٰ بطور عذر قبول نہیں کریں گے اور ایسے لوگوں کو جہنم کی سزا سنائیں گے۔

یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے سامنے توحید کو آخری درجے میں واضح کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے تعصّبات انھیں گھما پھرا کر شرک کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے سامنے بے گناہ اور معصوم بچوں اور عورتوں اور مردوں کا قتل عام برپا ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنے تعصّبات کی بنا پر فیصلہ ہی نہیں کر پاتے کہ بے گناہ مقتول مظلوم ہے یا سفاکی سے قتل کر دینے والا مظلوم ہے۔

قرآن مجید بالکل واضح ہے۔ ایسے کھلے ہوئے، واضح اور برہنہ حقائق کو دیکھ کر بھی کنفیوز رہ جانے والے لوگوں کا انجام جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھتے رہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو کچھ بھی بتاتے رہیں۔

اہل محبت اور اہل ہوس

قرآن کہتا ہے کہ ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ کو بھول کر اپنی ذات کی محبت میں گم، مال و دولت کے طلبگار، حب جاہ سے سرشار، قومی تعصّبات میں گرفتار، فرقہ واریت کے اسیر اور غیر اللہ کی محبت میں جینے والے کسی شخص کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آ سکتی کہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبت کیسے کی جاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص ان چیزوں سے بلند ہونے کے لیے تیار ہو جائے تو اسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ یہ محبت کیا ہوتی ہے۔

یہ محبت محفل اور تنہائی ہر جگہ انسان کو اللہ ہی کی یاد دلاتی ہے۔ وہ غیر اللہ کی یاد میں جینے والوں اور غفلت کے ماروں کو اللہ کی یاد دلاتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اسے دیوانہ اور سودائی سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ دنیا اسے کیا کہتی اور کیا سمجھتی ہے۔

ایسا بندہ ہر رنگ میں خدا کا جمال، ہر ساز میں اس کی صدا، ہر نغمے میں خدا کی آواز اور ہر مہک میں عنایت الٰہی کا پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ لوگ اسے طعنے دیتے ہیں کہ تم اپنی شراب طہور نہ خود پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلا سکتے ہو، مگر نہیں جانتے کہ وہ ہر لمحہ شراب طہور پی رہا ہوتا ہے اور کسی میں دل ہو تو اسے پلا سکتا ہے۔ لوگ اسے موت سے خوف کے طعنے دیتے ہیں، مگر وہ خدا کے لیے جیتا اور اسی آس پر جیتا ہے کہ ایک روز اسے راہ خدا میں موت آ جائے۔ وہ ہر مخالفت، ہر الزام، ہر بہتان کو اللہ کے لیے جھیلتا چلا جاتا ہے، مگر اخلاق کی سطح سے گر کر کبھی کسی کو جواب نہیں دیتا کہ یہ محبت کے نام کی سب سے بڑی رسوائی ہے۔

یہ محبت اس کا دعویٰ نہیں، اس کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کا نعرہ نہیں، اس کا عمل ہوتی ہے۔ اس کی تقریر نہیں اس کی تصویر ہوتی ہے۔ اس کی صورت نہیں، اس کی سیرت ہوتی ہے۔ اس محبت کے نمونے اگر دیکھنے ہیں تو یہ سب سے بڑھ کر پیغمبروں کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔

یہ نوح ہیں۔ ہزار برس گزار دیے مگر قوم کفر سے باز نہ آئی۔ یہ وقت آ گیا کہ بال سفید ہو گئے۔ کمر خمیدہ ہو گئی۔ نئی نسلیں ان کی دعوت کا جواب تمسخر اور استہزا سے دیتی ہیں۔ انھیں دیوانہ بڈھا کہا جاتا ہے۔ مگر بڑے صبر کے ساتھ ہر الزام اور تمسخر سہتے رہے۔

یہ ابراہیم ہیں۔ زندگی بھر راہ خدا میں لگا دی۔ بیوی اور بھتیجے کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ کر بڑی مرادوں سے اولاد ملی۔ اکلوتا فرزند اور کیا خوب فرزند اسماعیل۔ حکم ہوا۔ ذبح کر دو۔ بغیر ہچکچاہٹ کے بیٹے کو چھری کے نیچے لٹا دیا اور بیٹا بخوشی لیٹ گیا۔

یہ موسیٰ ہیں۔ عیش و عشرت میں پلنے والے شہزادے۔ ایک مظلوم کی مدد کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا۔ حکم ملا تو دنیا کی طاقتور ترین سپر پاور کے حکمران کے سامنے تن تنہا ڈٹ گئے۔ اپنی قوم نے بار بار دغا کی، مگر یہ پیکر وفا ہمیشہ وفاداری میں جیا اور اسی میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یہ داؤد ہیں۔ ایسے بہادر کہ جالوت جیسا جنگجو نہ ٹک سکا اور ایسے موسیقار کہ ان کی حمد یہ مزمور پر پہاڑ اور پرندے اور کل کائنات جھوم اٹھتی۔ مگر پہلے وقت کے بادشاہ کے ستم کا شکار ہوئے اور جب خود باشاہ بن گئے تو قوم نے ان پر ہی بدکاری کا الزام لگایا اور منصب نبوت سے فارغ کر دیا۔ مگر کوئی الزام انہیں صداقت کی راہ سے باز نہ رکھ سکا۔

یہ عیسیٰ ہیں۔ خدا کے نام پر کھڑے پتھر دل مذہبی رہنماؤں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ اس راہ میں کبھی کسی بہتان تراش کی پروا نہیں کی اور ہر دشمن حق کو بے نقاب کر کے چھوڑا۔

اور یہ خاتم النبیین ہیں۔ گالیاں، الزام، بہتان، پتھر، دشمنی، نفرت، عداوت سب جھیلا مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔ زندگی بندگی رہی۔ اسے یاد کرتے رہے اسے یاد دلاتے رہے۔

یہ ہوتی ہے محبت اور ایسے ہوتے ہیں اہل محبت۔ اب کسی میں حوصلہ ہے تو اہل ہوس کی صفوں سے نکلے اور اہل محبت کے گروہ میں شامل ہو کہ یہی نجات والوں کا گروہ ہے۔

سابقہ کتب اور مسلمان

قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں سے جن عقائد پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے ان میں سے ایک بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ وہ تمام انبیا پر اور ان پر اترنے والی کتابوں پر ایمان لائیں گے۔ قرآن مجید نے جگہ جگہ سابقہ انبیا اور ان کی تعلیمات کا ذکر کیا اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیا دین لے کر نہیں آئے بلکہ آپ کی ہستی سابقہ انبیا ہی کا تسلسل ہے۔

چنانچہ یہی سبب ہے کہ بالعموم مسلمان دیگر انبیا کا بھی ادب و احترام کرتے ہیں۔ تاہم ان انبیا کی کتابوں کے حوالے سے مسلمانوں میں ایک بڑی غلط فہمی عام ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ ان کتابوں میں جو کچھ ہے وہ غلط ہے کیونکہ ان کتابوں میں مکمل تحریف ہو چکی ہے۔ حالانکہ تاریخی اور واقعاتی طور پر بس اتنی بات ٹھیک ہے کہ اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں اصل تحریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیش گوئیوں اور حضرت ابراہیم کے حرم کعبہ کے تعلق کے حوالے سے کی ہیں۔ اس کے علاوہ جو تحریفات پائی جاتی ہیں وہ غالباً جان بوجھ کر نہیں کی گئی بلکہ انھوں نے اپنی تاریخی داستانوں اور سنی سنائی باتوں کو بطور تفسیر بیان کر کے اپنی اصل کتاب میں داخل کر دیا۔ قرآن مجید کے برعکس جس میں اصل وحی اور تفسیر الگ الگ رہتے ہیں بائبل میں ان دونوں کو ملا دیا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ نزول قرآن سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

چنانچہ مسلمان مفسرین قدیم کتب میں تحریف کی داستان جب سناتے ہیں تو واضح کر دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ نزول قرآن سے پہلے ہو چکا تھا۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیش گوئیوں کو ترجمے کے ذریعے سے بدل دیا۔

چنانچہ اس پس منظر میں یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہو رہا تھا یہ دوسری قسم کی ساری تحریفات پچھلی کتابوں میں موجود تھیں۔ مگر اس کے باوجود اللہ نے مسلمانوں کو

ان کتابوں پر ایمان لانے کا نہ صرف حکم دیا بلکہ ان میں موجود واقعات اور بیانات میں سے کچھ کی تصحیح کر کے اور کچھ کو بعینہٖ بیان کر دیا ہے۔

یہ گویا کہ وہی عمل ہے جسے مسلمان اہل علم نے احادیث کے معاملے میں سر انجام دیا ہے۔ قرون اولیٰ میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جھوٹ گھڑا جانے لگا یا آپ کی باتوں میں تحریف و اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں نے احادیث کو بالکلیہ رد کرنے کے بجائے قرآن مجید کا طریقہ اختیار کیا اور کوشش کی کہ ہر ضعیف، موضوع، منکر روایت کی نشان دہی کر دی جائے۔ جو باتیں علمی معیارات پر ٹھیک اترتی ہیں ان کو بیان کر دیا جائے اور جھوٹے اضافوں کو رد کر کے جہاں اصل بات موجود ہے اسے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔

ضرورت ہے کہ مسلمان یہی رویہ دیگر انبیا کی تعلیمات کے معاملے میں اختیار کریں۔ مسلمانوں کے پاس قرآن و سنت کی وہ کسوٹی موجود ہے جس کی بنیاد پر پرکھ کر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ سابقہ انبیا کی تعلیمات کا کون سا حصہ درست ہے اور کس میں تحریف ہو چکی ہے۔ کس حصے کو لیا جا سکتا ہے اور کسے چھوڑ دینا چاہیے۔

یہاں ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ہمیں سابقہ انبیا کی تعلیمات کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے۔ ہمارے نزدیک کئی وجوہات کی بنا پر یہ رویہ غلط ہے۔ پہلا یہ کہ مسلمانوں کے اس رویے کی بنا پر چودہ سو برس میں تورات، زبور اور انجیل میں نبی کریم کی متعدد پیش گوئیوں کو بدل دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان ان کتابوں کو اپنی کتابیں سمجھ کر محفوظ کر لیتے تو یہود و نصاریٰ پر اسلام کی سچائی ثابت کرنا بہت آسان ہو جاتا۔ آج بھی کوشش کی جائے تو آپ کی کئی پیش گوئیوں کو کتب قدیم سے واضح کیا جا سکتا ہے جو ابھی تک سامنے نہیں آئی ہیں۔ ایسی ہی ایک پیش گوئی زبور کے حوالے سے ہماری کتاب ''ملاقات'' میں شامل ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ صرف شریعت محمدی علی صاحبھا السلام ہے جس میں مسلمانوں پر لازم ہے کہ

آپ کے علاوہ کسی اور کی پیروی نہ کریں، باقی معاملات میں تو حال یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہ صاف حکم دیا تھا کہ ملت ابراہیم (النحل 123:16) اور انبیا سابقہ کے طریقے کی پیروی کریں (الانعام 90:6)۔ عام علما اس حکم سے کیسے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ حکمت بندہ مومن کی متاع گمشدہ ہے۔ اسی اصول پر ہم بزرگوں کے اقوال سے استفادہ کرتے ہیں خواہ وہ ہماری اپنی قوم کے ہوں یا دوسری تہذیب کے۔ سوال یہ ہے کہ کیا حضرات انبیا کی ہمارے نزدیک یہ حیثیت بھی نہیں ہے کہ ان کی بات کو ان کی اپنی کتابوں سے لیا جائے جبکہ ان کی متعدد باتیں، دعائیں، اقوال اور واقعات خود قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں۔

اگلی بات یہ ہے کہ مسلمان اس وقت دورِ زوال میں ہیں۔ اس کا کوئی ماڈل زمانہ رسالت، نزول قرآن اور عہد صحابہ میں نہیں ملتا۔ نہ قرآن و حدیث میں براہ راست اسے موضوع بنایا گیا ہے۔ بلکہ درحقیقت جتنا موضوع بنایا ہے قدیم اقوام اور قدیم کتب کے حوالے سے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل ہی وہ گروہ ہے جو نزول قرآن سے قبل ہمارے جیسے دورِ زوال سے گزرا تھا۔ چنانچہ اس وقت ان کے انبیا نے جو کچھ کہا اور جو کچھ سمجھایا اور جس کا اجمالی ذکر خود قرآن میں بھی آیا ہے، اس سے بڑھ کر اس وقت ہمارے لیے کوئی رہنمائی نہیں۔ یہ رہنمائی تفصیلی طور پر صرف قدیم صحف سماویہ ہی میں مل سکتی ہے۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان علما کو قدیم کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور انبیا سابقہ کی تعلیمات کو گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بات طے ہے کہ اب ہم قرآن و حدیث کے ذخیرے سے محروم نہیں ہو سکتے۔ مگر ہم نے غفلت کا مظاہرہ کیا تو دیگر انبیا کی تعلیمات میں جو انتہائی قیمتی مواد دعوتی اور تربیتی پہلو سے دستیاب ہے، اس سے ہم ضرور ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

حضرت عمر اور تورات

مسلمانوں میں ایک روایت بہت مشہور ہوگئی ہے جس کی بنا پر یہ خیال عام ہے کہ سابقہ انبیا کی کتب کا مطالعہ گناہ ہے۔ روایت کے مطابق ایک دفعہ حضرت عمر نے تورات کا ایک نسخہ عربی میں لکھا اور حضور کے پاس لا کر سنانے لگے جس پر آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ بعض انصار یا ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکر نے آپ کو توجہ دلائی کہ رسول اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تو دیکھ لو۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اگر موسیٰ بھی اس وقت ہوتے تو میری ہی پیروی کرتے۔ مگر درحقیقت یہ ایک ضعیف روایت ہے۔ اس کا ایک راوی جابر الجعفی متہم بالکذب ہے جس کے بعد یہ روایت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

بالفرض اس روایت کی کوئی حقیقت ہوتی تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا کہ آخری شریعت کے بعد کسی اور شریعت کی پیروی جائز نہیں۔ اگر موسیٰ بھی اس وقت ہوتے تو میری ہی پیروی کرتے کے الفاظ سے یہی بات واضح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پہلو سے یہ ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کی طرف دیکھا جائے چاہے وہ کوئی نبی ہی کیوں نہ ہو۔

مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید کا نزول ہو رہا تھا۔ اس وقت سب سے بڑا کام قرآن مجید کو محفوظ کرنا تھا۔ اس لیے احادیث تک کو لکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایسے زمانے میں حضرت عمر جیسے آدمی کا قرآن کے بجائے کسی اور چیز میں لگنا کسی صورت درست نہیں تھا۔ چنانچہ کسی پہلو سے بھی یہ روایت کوئی اصولی ہدایت نہیں دیتی۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں دور صحابہ سے لے کر آج تک اہل علم قدیم صحف سماویہ کو پڑھتے اور نقل کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کسی طالب علم کا قدیم کتابوں سے دین حق کی سچائی اور کسی نصیحت اور نیکی کی بات کا نقل کرنا کسی پہلو سے غلط نہیں۔

پھر فرض کیجیے

فرض کیجیے کہ آج رات آپ کو اپنی بیگم کے ساتھ کسی شادی میں جانا ہے۔آپ دونوں بینک جاتے ہیں اور بیگم کے پہننے کے لیے ساری جیولری نکلوا کر گھر لے آتے ہیں۔راستے بھر میں آپ کسی چور راہزن سے ڈرتے رہتے ہیں۔یہی حال شادی میں جاتے اور آتے وقت رہتا ہے مگر کچھ نہیں ہوتا۔آپ دونوں اطمینان اور بے فکری سے سو جاتے ہیں۔صبح اٹھنے پر پتہ چلتا ہے کہ چور رات میں آئے اور خاموشی سے آپ کے گھر سے سارا زیور چرا کر لے گئے ہیں۔آپ تھانے کے چکر لگاتے ہیں۔پولیس کی منت کرتے ہیں کہ آپ کا کل سرمایہ لٹ چکا ہے مگر بے سود۔

فرض کیجیے آپ ایک نوجوان بچے کے باپ ہیں جس سے آپ کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔وہ روز کالج جاتا ہے۔محنت سے پڑھتا ہے۔آپ خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ایک روز آپ کو پتہ چلتا ہے کہ کالج سے واپسی پر اسے ایک بس نے ٹکر ماردی۔آپ کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔آپ دیوانہ وار دفتر سے ہسپتال بھاگتے ہیں۔پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہیں جو آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھی بلک بلک کر رو رہی ہوتی ہے۔ڈاکٹر آپ کو آکر بتاتا ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں۔آپ ڈاکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتے ہیں کہ میرے بچے کو بچا لیجیے۔

فرض کیجیے کہ چند دن سے آپ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔مگر ایسی نہیں کہ چھٹی لے کر گھر بیٹھ جائیں۔مگر آپ مکمل نارمل بھی نہیں۔آپ اپنے مسائل لے کر فیملی ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔وہ کچھ دوائیں دیتا ہے۔کچھ ٹیسٹ لکھتا ہے۔آپ دوا کھاتے ہیں۔فائدہ ہو جاتا ہے۔مگر احتیاطاً آپ ٹیسٹ بھی کرا لیتے ہیں۔ٹیسٹ کی رپورٹ آنے پر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کینسر کا جان لیوا مرض لاحق ہے۔آپ کے گھر میں کہرام مچ جاتا ہے۔پھر علاج شروع ہوتا ہے۔لاکھوں روپے برباد کر کے اور بے پناہ تکلیف اٹھا کر بھی آپ ہسپتال کے بستر پر پڑے موت کی آہٹ سننے پر مجبور ہیں۔آپ کے بچے تڑپ رہے ہیں۔بیوی کے چہرے پر تاریکی

چھائی ہوئی ہے۔آپ کی دنیا بھی اندھیر ہو چکی ہے۔

اطمینان رکھیے۔ ہم صرف فرض کر رہے ہیں۔ ابھی تک ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔آپ نے جیولری باحفاظت بینک لاکر میں رکھوادی۔آپ کا بچہ روز پڑھنے جاتا ہے اور خیر سے آجاتا ہے۔ آپ کی طبیعت گرچہ ناساز ہوئی مگر معمولی سا مسئلہ تھا جو دوا سے حل ہو گیا۔اس دنیا میں اس جیسی ہزار چیزیں فرض کی جاسکتی ہے۔مگر ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔آپ کو کسی کی منت نہیں کرنی پڑتی۔کسی کے آگے گڑ گڑانا نہیں پڑتا۔آپ کی بیوی بلک بلک کر نہیں روتی۔آپ کے بچے تڑپتے نہیں۔آپ کا مال محفوظ ہے۔عزت کو بٹہ نہیں لگا۔جان عافیت میں ہے۔

چلیے دو لمحے کے لیے ایک دفعہ پھر فرض کر لیجیے کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔آپ کا مال لٹ گیا ہے۔آپ کی جوان بیٹی کی آبرو پر حرف آ گیا ہے۔آپ کا بچہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔آپ خود ہسپتال میں پڑے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کر رہے ہیں۔کرب کے ان لمحوں کا تصور کیجیے۔سوچیے کہ آپ کو کہاں کہاں بھاگنا اور کن کن لوگوں کے آگے گڑ گڑانا پڑ رہا ہے۔اور پھر اس ہستی کا تصور کیجیے جو عافیت کا قلعہ بن کر آپ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

وہ آپ سے کچھ نہیں مانگ رہا۔مگر آپ اس کے قدموں پر احسان مندی کے جذبے سے گر جائیے کہ اس نے آپ کے مال کو بچالیا۔وہ اپنے احسانوں پر اپنی تعریف نہیں سننا چاہتا۔مگر آپ بہتی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوتے ہونٹوں سے اس کی تعریف کیجیے کہ آپ کی اولاد محفوظ ہے۔وہ آپ کے ہر گناہ کو دیکھ کر بھی انجان بن رہا ہے اور عافیت،نعمت اور زندگی نہیں چھین رہا۔ آپ بھی عزم کر لیں کہ اب کبھی اس کو ناراض نہیں کریں گے۔

ابھی وقت ہے۔ جس نے دوسرے کے سامنے جھکنے نہیں دیا۔ اس کے سامنے جھک جائیں۔ جس نے دوسروں کے سامنے تڑپنے سے بچالیا اس کے سامنے رولیں۔ جس نے دوسرے کا احسان اٹھانے سے بچالیا اس کی بندگی اختیار کرلیں۔

تین نسلوں میں

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز ادا کی اور ارشاد فرمایا کہ آج روئے زمین پر جتنے انسان زندہ ہیں سو سال بعد ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا (بخاری: رقم 601)۔ اس بات سے سامعین میں سے بعض کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ حضور قیامت کے آنے کا ذکر کررہے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ زندگی کا عارضی پن واضح کرنے کا ایک کا بڑا موثر طریقہ تھا۔

انسانوں کی اوسط عمر عام طور پر ساٹھ ستر برس ہوتی ہے۔ جبکہ انفرادی طور پر سو برس سے زیادہ بالعموم کوئی شخص نہیں جی پاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سن 1914 میں جو لوگ پیدا ہوئے وہ آج 2014 میں موجود نہیں اور جو آج ہیں ان میں سے کوئی 2114 میں نہیں ہوں گے۔ زندگی کی ناپائیداری کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ سو برس میں انسان ہی نہیں مرتا تیسری نسل میں اس کا نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے۔

ایک شخص جب اوسط عمر میں مرتا ہے تو وہ اپنی اولاد کو اپنے سامنے پروان چڑھتا دیکھتا ہے۔ اس کی اولاد کی اس سے بڑی گہری وابستگی ہوتی ہے۔ اس کے مرنے پر اولاد کو بہت دکھ اور غم ہوتا ہے۔ لیکن چند برسوں میں یہ اولاد اس کا بنایا ہوا گھر چھوڑ چکی ہوتی ہے۔ اس کی یادیں مدھم ہوجاتی ہیں۔ اس کی برسی فراموش کردی جاتی ہے۔

جب پوتے اور نواسے بڑے ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں بزرگوں کے بس دھندلے سے نقوش ہوتے ہیں۔ یہ نقوش بس اسی وقت تازہ ہوتے ہیں جب کسی کو دفنانے قبرستان جانا ہوتا ہے اور باپ بیٹے کو بتاتا ہے کہ یہ اس کے دادا کی قبر ہے۔ مگر پوتے کی اولاد تک قبر کا نشان بھی مٹ جاتا ہے اور یوں تیسری نسل میں انسان کا نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے۔

کتنا نادان ہے وہ انسان جو اِس دنیا کے لیے جیتا ہے جہاں سو سال میں وہ خود اور تین نسلوں میں اس کا نام ونشان بھی مٹ جائے گا۔

داستان غم

آج کے دور میں جس سے ملیے وہ اپنے دکھوں اور مسائل کی داستان سناتا ہوا ملے گا۔ جو مسائل کا ذکر نہیں کرتا وہ نہ ملی ہوئی چیزوں اور محرومیوں پر سراپا حسرت و یاس بنا ہوا ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے پاس موضوع گفتگو اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ ان کے پاس کیا نہیں ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ گفتگو وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دور میں انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک عام آدمی کو بھی وہ کچھ میسر ہے جو ماضی میں بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں تھا۔

اس بات کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آج کے لوگوں کو رفع حاجت کے لیے کمرے سے باہر بھی نہیں جانا پڑتا اور اسی اٹیچ باتھ روم میں وہ سخت سردی میں گرم پانی سے نہاتے ہیں۔ جبکہ سخت گرمی میں ٹھنڈے اے سی اور مسلسل ہوا والے پنکھے کی ہوا کبھی کسی فاتح عالم کو بھی نہیں نصیب نہ ہوسکی۔ ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹے میں طے کرکے مکہ پہنچنے کی سہولت کبھی کسی پیغمبر کے حصے میں بھی نہیں آئی۔ مگر آج کے ہر انسان کے لیے یہ معمول کی بات ہے۔

ان جیسی نجانے کتنی مثالیں ہر سو بکھری ہوئی ہیں۔ مگر کوئی شخص ان کو دریافت کرکے اپنے مالک کے حضور سجدے میں نہیں گرتا۔ کوئی نہیں جو روتا اور گڑگڑاتا ہوا یہ کہے کہ پروردگار تو نے مجھے وہ آسانی دی جو کسی بادشاہ کو دی اور نہ اپنے عظیم نبیوں کو عطا کی۔ ہاں غربت کے شکوے بہت ملیں گے۔ محرومی کی شکایت بہت بیان ہوگی۔ مایوسی کے قصے بہت سنائے جائیں گے۔

مگر کاش کوئی ان دکھی لوگوں کو یہ بتائے کہ یہ ہزار پاکر ایک کے کھونے کا شکوہ کر رہے ہیں۔ اہم ترین پاکر بہت کم کی محرومی سے رنجیدہ ہیں۔ کاش یہ لوگ اس حقیقت کو جان لیں تو ان کے دکھ کے آنسو شکر گزاری کے موتیوں میں بدل جائیں گے۔ ان کی محرومیاں احسان مندی کے لہجے میں ڈھل جائیں گی۔ پھر ایک روز خدا انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی ختم نہ ہونے والی نعمتوں میں بسا دے گا۔ جہاں کوئی دکھ ہوگا نہ کوئی محرومی۔

اسلامی روحانیت

اسلام ایک ایسے دور میں آیا جب دنیا میں روحانیت کا مطلب ترک دنیا، عبادت کے نام پر مشقت اٹھانے اور رشتے ناطوں سے قطع تعلق کا نام تھا۔ مگر ایسے میں اسلام نے روحانیت کا ایک بالکل جدا اور منفرد تصور دیا جو کسی کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا۔

اس روحانیت کی پہلی اساس ایک اللہ سے سچی محبت تھی۔ مگر اس محبت کا مطلب دنیا چھوڑنا نہیں بلکہ اس کی یاد میں رہ کر دنیا میں جینا تھا۔ اس روحانیت میں تہجد پڑھنے سے زیادہ اہمیت مسجد میں نماز پڑھنے پر تھی تاکہ دوسروں کے حال احوال سے باخبر رہا جا سکے۔ اس روحانیت میں انسان کا مال کمانا عبادت اور اسے بندوں پر خرچ کرنا عبادت کی معراج تھی۔ اس روحانیت میں روزہ رب کے لیے رکھا جاتا تھا، مگر احساس دوسروں کی بھوک کا پیدا کیا جاتا تھا۔

یہ روحانیت عدل کرنے کا نام تھی۔ چاہے دشمن کا معاملہ ہو یا اپنے ماں، باپ اور بھائی، بہن جیسے قریبی رشتوں کا۔ اس روحانیت کا اصول تھا کہ نبی کی بیٹی بھی اگر کسی جرم کا ارتکاب کرے تو اس کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

یہ روحانیت احسان کا نام تھی؛ کمزوروں کے ساتھ، ضعیفوں کے ساتھ، معذوروں کے ساتھ۔ یہ روحانیت ایثار سے عبارت تھی؛ اپنا مال دوسروں پر خرچ کر کے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلا کر، اپنا حصہ بھی دوسروں کی جھولی میں ڈال کر۔ یہ روحانیت انفاق کا مطالبہ کرتی تھی؛ رشتہ داروں پر، غریبوں پر، مسکینوں پر اور سفید پوشوں پر۔

یہ روحانیت لوگوں سے مسکرا کر ملنے، انھیں معاف کرنے، دوسروں کی ایذا پر صبر کرنے کا نام تھی۔ یہی وہ روحانیت تھی جس نے ایک دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ آہ مگر آج اسلام کے نام پر سارے تماشے ہو رہے ہیں۔ یہ ایمان، احسان اور عدل والی روحانیت کہیں نہیں۔

Intelligent Design

جدید علم الکلام میں خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل انٹیلی جنٹ ڈیزائن کی ہے۔ انٹیلی جنٹ ڈیزائن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کائنات ایک زندہ، باشعور اور ذہین خالق کی تخلیق ہے جس نے اس دھرتی پر کائناتی قوتوں کو اس طرح منظّم کیا ہے کہ یہ زندگی کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ اس حوالے سے ایک صاحب کے کچھ اعتراضات ایک دوست نے مجھے بھیجے۔ معترض کے بقول انسانی جسم میں جو بعض حیاتیاتی نقائص پائے جاتے ہیں، ان کی بنا پر انٹیلی جنٹ ڈیزائن کا تصور غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ انھوں نے قرآن کی آیت ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے'' کو لیا اور ان نقائص کی روشنی میں ثابت کیا کہ یہ آیت اور انٹیلی جنٹ ڈیزائن کا تصور دونوں ہی غلط ہیں۔

اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے ان صاحب نے انسانی جسم میں پائے جانے والے اپینڈیکس (Appendix) کو بطور مثال پیش کیا جو ان کے نزدیک انسانی جسم میں ہاضمے کی نالی کا ایک غیر ضروری حصہ ہے جو ارتقا کے عمل کے دوران میں باقی رہ گیا ہے۔ ان کے نزدیک اس اپینڈیکس (Appendix) کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانی جسم ناقص ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں۔ یہ بس اندھے ارتقا کی پیداوار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں سطحی اندازِ فکر کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ جدید تحقیق نے اب یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اپینڈیکس (Appendix) کا حصہ کچھ ایسے بیکٹیریا کی رہائش گاہ ہوتا ہے جو انسانی جسم کے لیے لازمی تو نہیں، مگر مفید ضرور ہوتے ہیں۔ سطحی سائنسی فہمی کے علاوہ یہ انداز فکر سطحی قرآن فہمی کا بھی نمونہ ہے۔ مثلاً قرآن کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''احسن تقویم'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے بہت سطحی انداز سے اس کا مطلب پرفیکٹ یا ''کامل'' نکالا اور اپنی طرف سے کچھ نقائص بیان کر کے یہ سمجھ لیا کہ قرآن کی تردید ہوگئی۔ حالانکہ کسی

چیز کا کامل ہونا بالکل الگ اور بہترین ہونا الگ ہوتا ہے۔ کامل کا مطلب بے عیب ہوتا ہے اور بہترین کا مطلب بے عیب نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کے مقابلے میں بہتر ہونا ہوتا ہے۔

انسانی جسم ہو یا اس کائنات میں کارفرما ڈیزائن، کوئی یہ نہیں کہتا کہ وہ پرفیکٹ ہے۔ بلاشبہ یہ کائنات، انسانی جسم اور دیگر مخلوقات کئی پہلوؤں سے ناقص ہیں۔ بلکہ ہمارا تو کہنا ہی یہی ہے کہ وہ آخرت کی دنیا ہوگی جو کامل ہوگی۔ لیکن کیا کوئی اس حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ اس دھرتی پر وہ سارے انتظامات کیے گئے ہیں جو اسے زندگی کا گہوارہ بنا دیتے ہیں۔ یہ انتظامات ایسی متنوع اور متضاد طاقتوں کو ایک نظم میں لا کر کیے گئے ہیں جو عام حالات میں زندگی کے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس حقیقت کا انکار کرنا سورج کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

یہ کائنات، کرہ ارض، وجود انسانی ہر پہلو سے اس طرح بنایا گیا ہے کہ انسان زندہ رہتے ہیں اور کائنات کی ہر چیز ان کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ حالانکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ کائنات ایک قاتل کائنات ہے جو اپنی اصل میں زندگی کی ہر شکل کے لیے موت کا پیغام ہے۔ مثلاً اس کرہ ارض کے علاوہ کائنات میں ہر جگہ درجہ حرارت اتنا زیادہ یا اتنا کم ہے کہ زندگی ایک لمحہ میں ختم ہو جائے گی۔ مگر ایک خالق نے اس دھرتی پر کائناتی قوتوں کو اس طرح منظّم کیا ہے کہ ہر چیز حیات بخش ہو چکی ہے۔ اسی کو انٹیلی جنٹ ڈیزائن کہا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں بلاشبہ یہ بہترین انتظام ہے، گرچہ یہ بعض پہلوؤں سے کامل نہیں۔ تاہم اس غیر کاملیت کی بھی اپنی حکمت ہے، لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اپنی ذات میں اپنے خالق کا تعارف ہے جو کتاب ہستی کے ہر ورق پر لکھا ہے۔ لیکن یہ ورق غور و فکر کرنے والے ہی پڑھ سکتے ہیں۔ سرسری انداز سے دیکھنے والے نہیں۔

حساب کے پرچے میں شاعری

امتحان لینا اور دینا تعلیمی عمل کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے۔ طلبا سال بھر پڑھتے ہیں، مختلف علوم کی سمجھ پیدا کرتے ہیں اور ان جوابات کی تیاری کرتے ہیں جن کے بارے میں امتحان میں سوال پوچھے جائیں گے۔ امتحان میں کسی طالب علم کی کامیابی کا تمام تر انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس نے سوال کا درست جواب دیا یا نہیں۔ حساب کے پرچے میں اگر شاعری، گرامر اور سائنس کے پرچے میں مذہب اور اخلاقیات کے بھاشن لکھ دیے جائیں تو ممتحن بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فیل کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں حساب کے پرچے میں جمع کے سوال میں تفریق اور ضرب کے سوال میں تقسیم کی کہانی لکھنے کا انجام بھی کچھ مختلف نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی کامیابی اور جہنم سے نجات کسی شخص کے لیے ممکن نہیں جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے پرچہ امتحان میں سرخرو نہیں ہو جاتا۔ اس امتحان میں اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا کرم کیا ہے کہ سوال بھی بتا دیے ہیں اور ان کے جواب بھی بیان کر دیے ہیں۔ مگر یہ عجیب سانحہ ہے کہ ہم مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمیں بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں بھیج دیا جائے گا اور جتنے کچھ سوالات ہوں گے وہ غیر مسلموں سے ہوں گے۔ جو لوگ خود کو کسی امتحان میں کھڑا دیکھتے ہیں وہ بھی اپنے پرچہ امتحان میں ہر سوال کا غلط جواب لکھ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بتا چکے ہیں کہ قیامت کے دن بنیادی سوال اللہ تعالیٰ کی ہستی کو اپنے ایمان اور عمل کا مرکزی خیال بنانے کے حوالے سے ہوگا، مگر لوگ غیر اللہ کو زندگی کا مرکزی خیال بنا کر جیتے ہیں۔ سوال عبادات کے بارے میں ہوگا، لوگ خرافات اور بدعات کو دین بنا کر جیتے ہیں۔ سوال مخلوق کی خیر خواہی، دعوت اور محبت پر ہوگا، مگر ہم نفرت اور دہشت کو اسلام قرار دیتے ہیں۔

لوگوں کا جو دل چاہے وہ لکھتے رہیں مگر اس دینداری کا وہی انجام ہونا ہے جو حساب کے پرچے میں شاعری لکھنے والوں کا ہوتا ہے۔

بیلنس شیٹ

کاروباری اداروں میں نفع نقصان کا حساب رکھنے کے لیے کمپنی کی بیلنس شیٹ بنائی جاتی ہے۔ یہ بیلنس شیٹ بتاتی ہے کہ ادارے کے پاس کیا کچھ ہے، کیا لینا ہے اور اسے دوسروں کو کیا ادا کرنا ہے۔ یہ بیلنس شیٹ متعدد مراحل سے گزر کر تیار ہوتی ہے جس میں کئی مرحلوں پر حساب کتاب رکھ کر تیار کیا جاتا ہے اور اسے دیکھ کر ایک لمحے میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ادارہ مالی طور پر نفع میں ہے یا نقصان میں جا رہا ہے۔

ہر ادارہ یہ اہتمام کرتا ہے کہ بیلنس شیٹ صحیح بنے۔ کسی کمپنی میں یہ ممکن نہیں کہ حقیقت کچھ اور ہو اور اعداد و شمار غلط ڈال کر بیلنس شیٹ تیار کی جائے۔ اثاثے لاکھ کے ہوں اور بیلنس شیٹ میں کوئی خوش فہم کروڑ لکھ دے۔ ادائیگیاں دس کروڑ کی کرنی ہوں اور غلط فہمی سے دس لاکھ کی لکھ دی جائیں۔ یہ اگر کسی نے کیا تو اسے بدترین نقصان اٹھانا پڑے گا۔

بدقسمتی سے ہم میں سے بیشتر لوگ اپنے نامہ اعمال کی بیلنس شیٹ ایسی ہی غلط بیانیوں اور خوش فہمیوں کی بنیاد پر بناتے ہیں۔ ہم ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتے بلکہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو معیار بنانے کے بجائے اپنے تعصّبات کے تحت غلط فہمیوں اور اپنی خواہشات کے تحت خوش فہمیوں کا شکار ہو کر کرتے ہیں۔ ہم ایمان، عدل، احسان اور انفاق کو بھول جاتے ہیں اور اپنے خود ساختہ معیارات پر ہر لمحہ اپنی بیلنس شیٹ میں ستر ہزار نیکیوں کا ثواب لکھتے رہتے ہیں۔ ہم ظلم، ناانصافی، حق تلفی اور الزام و بہتان کو چھوٹی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ ان کی موجودگی ہمارے ہر عمل کو صفر کر کے ہمیں ابدی خسارہ سے دوچار کر دے گی۔

اپنے تعصّبات اور خواہشات کو دین سمجھ کر بیلنس شیٹ میں ڈالنے سے نجات ممکن نہیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنے ہر عمل کو قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھنا اور سیرت طیبہ کے معیار پر تولنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہم خود کو جو بھی سمجھیں، قیامت کے دن ہماری بیلنس شیٹ صرف خسارہ دکھائے گی۔

معذوری

ہم میں سے ہر شخص زندگی میں جب کبھی سخت بیمار ہوتا ہے تو وہ ایک نوعیت کی عارضی اور جزوی معذوری کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ اس مرحلے میں ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مستقل اور مکمل معذوری کے ساتھ زندگی گزارنا کس قدر مشکل کام ہے۔ معذور کی مصیبت کو سمجھنے کا ایک اور ذریعہ کسی معذور شخص کو قریب سے دیکھنا اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا ہے۔ اس کے بعد ہی ہمیں اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس دنیا میں معذوری سے بڑی مصیبت کم ہی ہوتی ہے۔

دنیا میں کوئی بھی معذور نہیں ہونا چاہتا۔ مگر پھر بھی لوگ معذور ہو جاتے ہیں۔ معذوری سے متعلق ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں جزوی طور پر معذور ہو جانے والوں کی شرح پندرہ فیصد جبکہ مکمل طور پر معذور لوگوں کی شرح دو تا چار فیصد ہے۔ یہ معذور لوگ سخت ترین حالات میں زندگی گزار کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ تاہم کل قیامت کے دن جب یہ معذور لوگ اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو ان کی معذوری قیامت کے دن ان کے لیے ایک عذر بن جائے گی۔ مالک دو جہاں ان کے ساتھ بہت نرمی اور درگزر کا معاملہ کر کے ان کے حق میں اپنی رحمت کا فیصلہ کر کے اپنے فضل سے نوازیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ذریعہ بنا کر صحت مند لوگوں کو یہ پیغام دیا تھا کہ وہ کس درجے کی عافیت اور آسانی میں زندہ ہیں۔

دوسری طرف ہمارے جیسے صحت مند اور صحیح و سالم لوگ جب اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو ان کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی کتنی شکر گزاری کی۔ اس کی کتنی بندگی کی۔ اپنے اعضاء کو اس کی نافرمانی سے کتنا روکا۔ ہاتھ پاؤں، گویائی اور بصارت، صحت اور عافیت کو بندوں کی مدد میں کتنا لگایا۔ نصرت دین کا کیا کام کیا۔ اس روز بہت سے صحت مند یہ خواہش کریں گے کہ کاش وہ معذور پیدا ہوتے۔ کاش وہ معذور ہی مر جاتے۔

سوائے ان کے

قرآن مجید کا آغاز سورہ فاتحہ سے ہوتا ہے۔ یہ سورہ دراصل ایک دعا ہے۔ اس کا خلاصہ اگر کیا جائے تو یہ ہے کہ مانگنے والا یہ جانتا ہے کہ اس کا اور سارے جہانوں کا پالنے والا ایک انتہائی مہربان رب ہے۔ دینے والے نے مانگنے والے کے دست طلب کے جواب میں مادی نعمت کا ہر در کھول رکھا ہے۔ مگر مانگنے والا یہ جانتا ہے کہ بہت جلد ایک بدلے کا دن آرہا ہے جب دنیا کی تمام مادی نعمتیں بے کار ہو جائیں گی۔ اس دن صرف ہدایت کی روحانی نعمت ہوگی جسے دے کر نئی دنیا میں جنت کا مادی نفع ملے گا اور جہنم کا ضرر دور ہو گا۔

یہی ہدایت کی دعا سورہ فاتحہ کا مرکزی خیال ہے اور پورا قرآن اسی دعا کا جواب ہے۔ یہ ہدایت کلام الٰہی میں جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ یہ ہدایت اللہ کو سب سے بڑھ کر محبوب بنا لینے کا نام ہے۔ یہ رب کی بندگی اور اس کی اطاعت کا راستہ ہے۔ یہ والدین، اقربا اور ضرورت مندوں پر احسان اور انفاق کا نام ہے۔ یہ اپنوں ہی سے نہیں دشمنوں سے بھی عدل کرنے کا نام ہے۔ یہ شرک، فواحش، منکرات، معصیت، بدعت اور خبائث سے بچ کر زندگی گزارنے کا نام ہے۔ یہ ہدایت امانت و دیانت، عہد و میثاق کی پاسداری، صدق و سچائی پر قائم رہنے کا نام ہے۔ یہ غیبت، الزام، بہتان، جھوٹ، منافقت، ریاکاری سے دامن چھڑانے کا نام ہے۔

اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنی پاک کتاب میں اس ہدایت کی پوری تفصیل بیان کی اور پھر اس تفصیل کا خلاصہ اپنے محبوب کی بے مثل سیرت میں ہمارے لیے محفوظ کر دیا۔ صاحب خلق عظیم کا اسوہ حسنہ اسی ہدایت کا چلتا پھرتا نمونہ تھا جس کی تفصیل آج بھی ہم جانتے ہیں۔

ہدایت کے اس اہتمام کے بعد کوئی انسان گمراہ نہیں ہوسکتا۔ سوائے ان کے جو اپنے تعصّبات کی وجہ سے خدا کے غضب کا شکار ہو جائیں۔ سوائے ان کے جو اپنی خواہشات کا شکار ہو کر گمراہی کی پگڈنڈی پر چل پڑیں۔

دنیاوآخرت کی بھلائی

اس دنیا میں انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے منصوبے سے متعلق دو باتیں ایسی ہیں جن میں قرآن مجید آخری درجے میں واضح ہے۔لیکن لوگ ان دو باتوں کو ماننا نہیں چاہتے۔اسی چیز نے اسلام کے دعوے دار ہر شخص کو ذہنی سکون سے محروم کر رکھا ہے۔

پہلی بات جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ بے سکونی کا شکار ہیں وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ نے انسان کو آزادی دے کر بھیجا ہے اور اس امتحان میں ڈالا ہے کہ اسے کسی بیرونی دباؤ کے بغیر خود اپنی مرضی سے اس آزادی سے دستبردار ہو کر خدا کی بات ماننی ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو انسانوں کو یہ آزادی ہی نہ دیتے بلکہ دیگر مخلوقات کی طرح وہ بھی اختیار و آزادی سے محروم ہو کر اطاعت کرتے رہتے۔

بدقسمتی سے بہت سے لوگ اس حقیقت کو نہیں ماننا چاہتے۔وہ دعوت، تلقین، ترغیب و ترہیب اور تربیت کے بجائے نافذ کر کے، ٹھونس کر اور اب تو دھونس و دھمکی کے ساتھ اپنا فہم دین لوگوں سے منوانا چاہتے ہیں۔ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ کرنے والے ہمیشہ سکون و اطمینان سے محروم اور مسلسل اضطراب کا شکار رہتے ہیں۔

دوسری حقیقت اس امتحان سے متعلق یہ ہے کہ اس امتحان میں انسان کا نصب العین دنیا کو جنت بنانا نہیں، بلکہ ہر طرح کے حالات میں ایمان و اخلاق کے تقاضوں پر قائم رہ کر خود کو جنت کا حقدار ثابت کرنا ہے۔ یہ دنیا کبھی جنت نہیں بن سکتی۔ ہاں بہتر ہو سکتی ہے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔مگر یہ اصل مسئلہ نہیں۔اصل مسئلہ یہاں رہ کر ایمان و اخلاق کا بہترین نمونہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی بننے کی کوشش کرنا ہے۔

جس شخص نے ان دو باتوں کو سمجھ لیا وہ دنیا و آخرت کی ہر خیر پا گیا۔جس نے انھیں نہ سمجھا وہ دنیا و آخرت دونوں میں محروم اور بے سکون رہے گا۔

اگر منافق کو بھی......

جنگ تبوک اسلامی تاریخ کی اہم ترین جنگوں میں سے ایک ہے۔ اس جنگ میں ہر مسلمان کی شرکت لازمی تھی۔ مگر منافقین اس موقع پر مختلف عذر بنا کر راہ فرار اختیار کر گئے۔ چنانچہ سورہ توبہ نازل ہوئی اور اس میں منافقین پر اس طرح شدید گرفت کی گئی کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ اس سے قبل سورہ نساء، سورہ مائدہ، سورہ منافقون وغیرہ میں بھی منافقین پر بہت سخت تنقید کی گئی ہے۔ اور انھیں جہنم میں کفار سے بھی سخت سزا کا حقدار قرار دیا گیا ہے (النساء 4:145)۔

مگر قرآن پاک اور سیرت کا ایک طالب علم یہ جان کر حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ اس سخت ترین تنبیہات کے باوجود کبھی کسی منافق کو اس کے نفاق کی بنا پر کوئی شرعی سزا نہیں دی گئی۔ حتیٰ کہ سردار المنافقین عبداللہ ابن ابی جیسا شخص جس کا نفاق ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر تھا اور جو کفار اور یہود کا ساتھ دینے، مسلمانوں کو باہم لڑانے اور سیدہ عائشہ پر تہمت لگانے جیسے بدترین جرائم میں ملوث تھا، طبعی موت مر کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔

اس ناقابل یقین حقیقت کا سبب یہ تھا کہ منافقین ظاہری طور پر ہمیشہ خود کو مسلمان کہتے رہے۔ اور جب تک کوئی شخص خود کو مسلمان کہتا ہے، اس کی جان کسی صورت میں اور کسی قیمت پر نہیں لی جا سکتی۔ اگر اس کا کوئی ادنیٰ سا بھی جواز ہوتا تو دور رسالت میں مدینہ میں ایک منافق کو بھی زندہ چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہمارے تمام فقہا نے بھی قاتل، شادی شدہ زانی اور اسلام چھوڑنے کا اعلان کرنے والے کے سوا کسی مسلمان کے قتل کی اجازت نہیں دی۔

اس تاریخی اور ناقابل تردید حقیقت کے باوجود اگر آج ہمارے معاشرے میں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں کی جانوں کی حرمت پامال کی جارہی ہے تو اس کا ماخذ کچھ بھی ہو سکتا ہے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف اس کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ باخدا اللہ اور اس کا رسول ہر ایسی زیادتی سے بری ہیں اور خدا کا خوف رکھنے والا ہر مسلمان بھی اس جرم سے بری ہے۔

ایکس، وائی، زی تھیوری

ہمارے ہاں بیشتر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ دور جدید میں جتنا ارتقا سائنسی علوم میں ہوا ہے اتنا ہی یا شاید اس سے زیادہ ارتقا سماجی علوم میں ہوا ہے۔ سماجی علوم میں سے نفسیات اور سوشیالوجی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان پر کی گئی تحقیق سے سماجی ماہرین نے انسانوں کی کارکردگی کے حوالے سے تین نظریات پیش کیے ہیں جن کا استعمال عام طور پر مینجمنٹ سائنس میں کیا جاتا ہے۔ یہ ایکس، وائی اور زی تھیوری کہلاتی ہیں۔

ایکس تھیوری کے مطابق عام انسان کام سے بچنا چاہتے ہیں اور بغیر جبر اور دباؤ کے کام نہیں کرتے۔ وائی تھیوری اس کے برعکس نقطہ نظر پیش کرتی ہے یعنی لوگ دباؤ اور خوف کے بجائے اپنی اس فطری جبلت کے مطابق کام کرنا چاہتے ہیں جس کے نزدیک کام، کھیل اور آرام جتنا ہی اہم ہے اور عام حالات میں لوگ معاوضہ ملنے کی امید پر خود ہی ذمہ داری سے کام کر لیتے ہیں۔ زی تھیوری کے مطابق کسی شخص کے کام کرنے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ جس کے لیے کام کیا جا رہا ہے وہ اس کی ضروریات کا کس حد تک خیال کرتا ہے۔

یہ تینوں تھیوریاں اپنی اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں۔ دور جدید کے کارپوریٹ کلچر میں مینجمنٹ انھی کی بنیاد پر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ تاہم قرآن مجید کے ایک طالب علم کے لیے یہ قرآن مجید کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے آج سے ڈیڑھ ہزار برس قبل، جب کسی نے باقاعدہ علم نفسیات پر کام کیا تھا نہ سماجیات پر، بندوں اور رب کے تعلق کو جب موضوع بنایا تو ٹھیک انھی تین پہلوؤں سے انسانوں کو رب کی بندگی پر ابھارا۔

پہلا پہلو وہی ہے جسے ایکس تھیوری بیان کرتی ہے یعنی بعض اوقات اور کچھ لوگوں کے لیے

دباؤ ڈال کر جھنجھوڑ نا ہی ان سے کام کرانے کا درست طریقہ ہوتا ہے۔اس کو قرآن مجید انذار کہتا ہے۔یعنی اللہ کی پکڑ اور جہنم کی سزا اور اس کے عذابوں کی شدت کا تصور دلا کر لوگوں کو نافرمانی سے روکا جائے۔دوسرا پہلو وائی تھیوری والا ہے۔یعنی بندگی انسانوں کی فطرت میں شامل ہے اور جب ساتھ میں اللہ کی رضا اور جنت کی خوشخبری کے پہلو سے لوگوں کو ابھارا جاتا ہے تو لوگ اپنی فطرت کے زور پر اور جنت کے شوق میں اللہ کی عبادت اور بندگی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

تیسرا پہلو زی تھیوری والا ہے۔اس پہلو میں قرآن مجید لوگوں کو آسمان سے لے کر زمین تک اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ، رحمت ، شفقت اور عنایات کے ان انتظامات کی طرف توجہ دلاتا ہے جو انسان کی ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔قرآن مجید بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی دی۔عدم سے وجود بخشا۔اس کے لیے آسمان سے پانی اتارا۔دن کو سورج سے روشن کیا اور دامن شب کو چاند کا چراغاں دیا۔میاں بیوی کا محبت والا تعلق پیدا کیا۔پھر اس سے ان کی نسل چلائی۔ ہزاروں قسم کے جانداروں کے لیے صرف گھاس اور چارے کو پیدا کیا لیکن انسان کے لیے طرح طرح کے ذائقے پیدا کیے۔

ان جیسی ہزاروں نعمتوں کو یاد دلا کر قرآن مجید لوگوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جس رب نے ان کے لیے یہ سارے اہتمام کیے ہیں، وہی اس قابل ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔جس نے انسانوں کی ہر ضرورت کو پورا کیا اور مستقبل میں بھی پورا کرنے کی یقین دہانی کرا رہا ہے اسی کی عبادت کا راستہ درست راستہ ہے۔

انسان بندگی کی اس دعوت کو مانیں نہ مانیں یہ ان کا مسئلہ ہے لیکن قرآن کا یہ طریقہ دعوت اب سماجی علم کی ترقی سے بھی سند تصدیق حاصل کر چکا ہے۔یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن مجید اسی رب کا نازل کردہ ہے جو ہر انسان کا خالق اور سب سے بڑھ کر ان کی نفسیات کو جاننے والا ہے۔

جدید روحانیت اور اجنبی اسلام

روحانیت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی مذہب کی تاریخ ہے۔روحانیت کی کوئی حتمی اور متعین تعریف کرنا تو بہت مشکل ہے مگر عام طور پر اس سے مراد مقدس ہستیوں یا تصورات سے وابستگی، عقل اور حواس سے ماوریٰ روحانی تجربات ومشاہدات، مراقبہ،ترک دنیا، زہد و ریاضت اور ضبط نفس پر مبنی زندگی رہی ہے۔

زمانہ قدیم میں روحانیت مذہب اور تصوف کے ملاپ سے وجود میں آتی تھی۔ یہودیت، مسیحیت اور اسلام جیسے آسمانی مذاہب کے علاوہ ہندومت، بدھ مت اور جین مت جیسے مذاہب میں اس ملاپ سے پیدا ہونی والی روحانیت کی اساسات بہت مضبوط رہی ہیں۔ان مذاہب کے روحانی لوگوں کی مشترکہ اقدار وہی ہوتی تھیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں،البتہ اپنے اپنے مذاہب کے زیر اثر مقدس شخصیات،زہد وعبادت کے طریقے اور روحانی تجربات کی نوعیت میں کچھ تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔مگر ہر ایک کا مقصود مذہب کے قانونی پہلوؤں اور ظاہری مراسم سے بلند ہوکر اپنی ذات میں ڈوب کر دل کا سکون تلاش کرنا ہوتا تھا۔

تاہم دور جدید میں جب مذہب اور عقیدے کو انسان کی زندگی میں مرکزی مقام حاصل نہیں رہاہے،روحانیت کی ایک نئ قسم عام ہوچکی ہے جسے غیر مذہبی روحانیت یا Non Religious Spritiuality کہا جاتا ہے۔ ایک پہلو سے یہ دور جدید کے انسان کا نیا مذہب ہے جو مذہبی عقیدے، ظاہری شناخت، مراسم عبودیت سے ہٹ کر انسانیت کی اعلیٰ اقدار جیسے محبت، ہمدردی، رحم، درگزر اور باطنی اور ظاہری پہلوؤں سے انسان کو سکون اور آرام پہنچانے کا نام ہے۔ یہ رنگ ونسل سے بلند ہوکر کائناتی اور آفاقی انسانوں کی تشکیل پر مبنی مذہب ہے۔

مذہب سے بالاتر اس روحانیت کی مقبولیت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہورہا ہے۔

اس کی بنیادی وجہ اہل مذہب کا باہمی تفرقہ اور ایک دوسرے سے نفرت، اختلاف رائے پر عدم برداشت، متشددانہ اور انتہا پسندانہ سوچ، اپنے خیالات دوسروں پر ٹھونسنے اور بالجبر نافذ کرنے کا رویہ اور دہشت گردی کی حمایت اور تحفظ کا چلن ہے۔

انسان مذہب کی طرف امن اور سکون کے لیے آتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر کھڑے لوگوں سے محبت اور رواداری کی توقع رکھتا ہے۔ وہ مذہبی لوگوں سے بے غرضی اور بے لوثی کی توقع رکھتا ہے۔ وہ انھیں عدل و انصاف کا علمبردار دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ان چیزوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے جدید انسان مذہب سے بیزار ہو کر غیر مذہبی روحانیت کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ دین اسلام کو آج کے مسلمانوں کے بجائے اس کے اصل ماخذ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم یعنی قرآن مجید میں دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ یہاں ہر وہ چیز پائی جاتی ہے جسے دور جدید کا انسان موجودہ روحانیت میں ڈھونڈ رہا ہے۔ عدل، احسان، انفاق، امن، ایثار، عفو و درگزر، محبت، ہمدردی، خیر خواہی، صبر، رواداری یہاں بنیادی اقدار ہیں۔ رب کی بندگی، اس کے بندوں سے حسن سلوک، والدین، اہل خانہ، پڑوسیوں، ماتحتوں سے حسن سلوک، عورتوں، بچوں، بزرگوں، محروموں، کمزوروں، یتیموں اور ضعیفوں سے نیک برتاؤ اسلام کی اصل پہچان ہے۔ رشتہ داروں، ضرورت مندوں، فقیروں، مسکینوں، مانگنے والوں اور سفید پوشوں کو اللہ کی رضا کے لیے اپنا مال دینا اس دین کی تعلیمات ہیں۔ وہ کام جنھیں ہر انسان بے ہودہ کہے، ہر شخص منکر سمجھے، ہر نفس، حق تلفی مانے، ہر ذی شعور فحش کہے، ہر بندہ زیادتی کہے یہاں ممنوع ہے۔

یہی اسلام ہے۔ یہی اصل روحانیت ہے۔ اسی کی آج کے انسان کو سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔ مگر یہ اسلام تو مسلمانوں کے لیے بھی اجنبی ہے۔ دوسروں کو وہ یہ اسلام کیا دیں گے؟

سراب اور سچائی

’’اگر آپ ایک ارب پتی بزنس مین کے ہاں پیدا ہوتے یا آپ کے والد اس ملک کے وزیر اعظم ہوتے تو آپ کے محسوسات کیا ہوتے؟‘‘ عید کی ملاقات میں عارف سے جب کسی نصیحت کے بارے میں کہا گیا تو انھوں نے حاضرین کے سامنے ایک سوال رکھ دیا۔

ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ’’زندگی بدل جاتی۔ بہت اچھا لگتا۔ کوئی مشکل، مشکل نہ رہتی۔‘‘ اس طرح کے کئی جملے سننے کے بعد عارف نے کہا:

’’وزیر اعظم بہت معمولی ہستی ہوتا ہے۔ لوگ جب چاہیں اس کی حکمرانی چھین لیں۔ اس کے خلاف بغاوت ہوسکتی ہے۔ اس کا اقتدار کبھی بھی ختم ہوسکتا ہے۔ یہی معاملہ بزنس مین کا ہے جو دیوالیہ ہوسکتا ہے۔ اس کا کاروبار تباہ ہوسکتا ہے۔‘‘ عارف لمحے بھر کے توقف کے بعد گویا ہوئے۔

’’اس لیے ان کی اولاد نہ ہونے پر افسوس نہ کریں۔ خوشی اس پر منائیں کہ آپ کو اللہ نے اپنے بندے کے طور پر پیدا کر دیا ہے۔ خوشی اس پر منائیں کہ اس نے آپ کو جنت کا راستہ دکھا دیا ہے۔ اس راستے پر چل کر بہت جلد ساری دنیا کا اقتدار آپ کے قدموں میں ہوگا۔ ساری دنیا کے سونے چاندی سے زیادہ دولت آپ کے پاس ہوگی۔ ہر نعمت اور کامیابی آپ کا مقدر ہوگی۔‘‘

عارف کی بات ابھی جاری تھی کہ مجلس میں نئے آنے والے ایک فلسفی بول پڑے: ’’مذہب کا سراب‘‘۔ عارف نے مسکرا کر انھیں دیکھا اور کہا:

’’ہماری آنکھ کے سامنے ایک بچہ عدم سے وجود میں آتا ہے۔ اس کی ماں کا خون معجزانہ طور پر اس کے لیے دودھ بن جاتا ہے۔ یہ تو سراب نہیں۔ جب پیٹ کی قبر سے زندگی نے جنم لیا تو یہ معجزہ ہوگیا۔ جب زمین کی قبر سے زندگی دوبارہ پھوٹے گی تو وہ معجزہ بھی ہوجائے گا۔ خدا سراب نہیں سچائی ہے۔ اس کے فیض نے اس قاتل کائنات میں زمین کی یہ جنت بنا دی ہے۔ عنقریب اس کا فیض ختم نہ ہونے والی جنت بنائے گا۔ مگر یہ جنت بندوں کو ملے گی۔ مجرموں کو نہیں۔‘‘

عارف خاموش ہوگئے۔ اب لوگوں کے سوچنے کا وقت تھا کہ وہ بندے ہیں یا مجرم۔

شریعت کی اہمیت

شریعت اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔اس کی اہمیت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور مسلمانوں کے بیچ ایک عہد و میثاق قرار دیا ہے (مائدہ 7:5)۔شریعت کی اصل اہمیت یہ ہے کہ یہ ہمیں دین کی اصل دعوت یعنی ایمان و اخلاق کا ایک قابل عمل اور موجودہ سائنٹفک طریقہ کے لحاظ سے ایک پیمائشی (measureable) نمونہ فراہم کرتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ اللہ اور آخرت پر ایمان کا اخلاقی مطالبہ یہ ہے کہ اپنا مال خرچ کریں۔اگر دین یہ حکم دے کر خاموش ہو جاتا تو اہل ایمان کے لیے ایک سخت صورتحال پیدا ہو جاتی۔انھیں کبھی پتہ ہی نہیں چل پاتا کہ وہ کیا اور کتنا خرچ کریں کہ اس مطالبے کی تکمیل کر کے وہ اللہ کی گرفت سے بچ سکیں۔عقل تو یہ کہتی ہے کہ جب سب اللہ نے دیا ہے تو اللہ کا حق ہے کہ سب ہی اس کی راہ میں لٹا دیا جائے۔مگر یہی عقل بتاتی ہے کہ اگر سب لٹا دیا تو اپنے حال اور مستقبل کی ضروریات کا کیا ہو گا۔

شریعت اس سوال کا جواب یہ دیتی ہے کہ اپنی بچت کا ڈھائی فیصد سالانہ اور پیداوار پر عشر یا دسواں حصہ دے کر انسان خود پر عائد کم از کم ذمہ داری سے چھوٹ جاتا ہے۔اس کے بعد جتنی توفیق ہو اتنا خرچ کرے اور جنت کے بلند درجات حاصل کرے۔شریعت دین کے ہر اخلاقی حکم کے معاملے میں ایسی ہی متوازن اور قابل عمل قانون سازی کرتی ہے۔

شریعت کا یہی وہ توازن اور اس کی یہی اہمیت ہے جس کی بنا پر علما کو اپنے فہم کو کبھی شریعت بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔عالم کتنا بڑا کیوں نہ ہو اس کی رائے غیر متوازن ہو سکتی ہے۔یہ صرف اللہ کی ہستی ہے جس کی عطا کردہ شریعت ہر حال میں قابل عمل اور ہر طرح کے افراط و تفریط سے پاک اور قابل عمل ہے۔اسی شریعت کو پیش کرنا آج کے دور کی بہت بڑی خدمت ہے۔

رحمت عالم کا مشن

تپتی دوپہر کی جھلستی دھوپ اور مسجد کے جلتے فرش سے گزر کر میں مسجد کے مرکزی ہال میں داخل ہوا تو یک لخت محسوس ہوا کہ دنیا بدل گئی ہے۔ یخ بستہ ہوا اور سرد ماحول پر مشتمل یہ ایک نئی دنیا تھی جس نے باہر کے موسم کی ہر تمازت کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔ کل تک یہی حال تھا جہاں کے پنکھے ظہر کی نماز میں باہر سے آنے والے نمازیوں کا پسینہ جذب کرنے میں بھی ناکام رہتے تھے۔ مگر آج چاروں طرف لگے اے سی سسٹم نے کایا پلٹ دی تھی۔ آج پریشان حال نمازیوں کے بجائے پرسکون چہرے بارگاہ الٰہی میں سربسجود تھے۔

مجھے یاد آیا کہ امام صاحب نے جمعہ کی نماز میں اے سی لگوانے والوں کے لیے دعا کروائی تھی۔ سوال اس وقت بھی پیدا ہوا تھا کہ ایجاد کرنے والے ایجاد نہ کرتے تو لگوانے والے اے سی کیسے لگواتے۔ ان کے لیے دعا کیوں نہ ہوئی۔ انھیں دینے کے لیے تو ہمارے پاس ہدایت کا تحفہ ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام نجات ہے۔ مگر سرکار کا پیغام پہنچانے کے لیے ان جیسا دل بھی چاہیے۔ شکایت سے بلند، محبت سے لبریز، سراپا دعا، سراپا کرم۔

آہ! مگر ایسا دل میں کن لوگوں میں ڈھونڈوں۔ چلیے دل نہ سہی دعا سہی۔ پوری نماز میں میرے دل سے ان لوگوں کے لیے دعا نکلتی رہی جنھوں نے انسانیت کو موسم کی شدت سے نجات دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دعا سنی جائے گی۔ نفرت کے پجاریوں کا دور ختم ہوگا اور ختم نبوت کے بعد کار نبوت کا علم اٹھائے کچھ اہل محبت اٹھیں گے اور دنیا کے ہر کونے تک اسلام کی دعوت، محبت اور امن کا پیغام پہنچا دیں گے۔

اہل نفرت شیطان کے مشن کی تکمیل کر رہے ہیں۔ وہ انسانیت کا دشمن ہے۔ اہل محبت نبی آخر الزماں کے مشن کی تکمیل کر رہے ہیں جو رحمت عالم ہیں۔

ایک نئی آواز

پچھلے دو ڈھائی سو برسوں میں مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کی فکری قیادت مغرب کی نفرت یا مرعوبیت کے تحت سوچتی رہی ہے۔ان کا اپنا کوئی نقطہ نظر، ورلڈ ویو یا زاویہ نگاہ نہیں رہا ہے۔

مسلم تہذیب ہزار برس تک دنیا پر اس طرح حکومت کرتی رہی ہے کہ افریقہ سے لے کر وسطی ایشیا اور یورپ سے لے کر جنوب مشرقی ایشیا تک پھیلی ہوئی متمدن دنیا میں کوئی اس کی ہم سری اور برابری کا تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔سیاست ہی نہیں تہذیب، تمدن، علم، فن، زبان، معاشرت اور تجارت میں کوئی اس سے آگے نہ تھا۔مگر اس کے بعد یورپ میں انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب رونما ہوا اور زوال پذیر مسلم معاشرے ایک ایک کر کے یورپ کی غلامی میں چلے گئے۔

اقتدار کل کے بعد کلی مغلوبیت کے اس تجربے نے دور غلامی میں پیدا ہونے والی مسلم فکری قیادت کو اس توازن سے محروم کر دیا جو قوموں کی رہنمائی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔کچھ کے نزدیک مغربی تہذیب کی اندھی پیروی ہی باعث شرف قرار پائی اور کچھ نے مغرب کی نفرت کو اپنی زندگی بنالیا۔

مسلمانوں کا اقتدار سے محروم ہونا عروج وزوال کے اس آفاقی قانون کا حصہ تھا جس کے تحت اللہ تعالیٰ اس دنیا کو چلا رہے ہیں۔مسلمان اخلاقی طور پر کمزور ہوئے تو انھیں بغداد کی تباہی اور اسپین سے نکالے جانے کا سانحہ دیکھنا پڑا۔عثمانی ترکوں اور سلاطین صفوی اور مغل ایمپائر کی شکل میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار گرچہ قائم رہا لیکن اس کے بعد وہ مسلسل علمی زوال کا شکار ہوتے چلے گئے۔جبکہ یورپ میں ایک علمی انقلاب برپا ہوا جو آخر کار ان کے عالمی غلبے کی شکل

میں انیسویں صدی کی سب سے بڑی حقیقت بن کر سامنے آیا۔

دوتہذیبوں کا یہ عروج وزوال اللہ تعالیٰ کے اپنے قانون کا نتیجہ تھا۔مگر بدقسمتی سے مسلمانوں کی فکری قیادت نے اسے ظلم اور سازش کا موضوع بنادیا۔انھوں نے پوری قوم کی تربیت اس اصول پر کی کہ یورپی اقوام نے سازش کر کے کچھ غداروں کی مدد سے مسلمانوں کو مغلوب کرلیا ہے۔دوتہذیبوں کے عروج وزوال کی اس سے زیادہ سطحی تعبیر ممکن نہیں تھی۔مگر بدقسمتی سے یہی تعبیر لوگوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوگئی۔اس کے نتیجے میں مغرب کی شدید ترین نفرت ہمارے فکری طبقات کے رگ وپے میں سرائیت کرگئی۔

یورپی اقوام جب مسلم ملکوں سے رخصت ہوئیں تو اقتدار کی ہما ان لوگوں کے حصے میں آئی جوجدید تعلیم کے حامل اورمغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔مغرب کی نفرت اب ان لوگوں کے خلاف نفرت میں تبدیل ہوگئی۔چنانچہ ایک طرف دنیا میں روس اورامریکہ کی سرد جنگ جاری تھی تو دوسری طرف مسلم مما لک میں مسلم اشرافیہ اور مذہبی فکری طبقات میں مسلسل کشمکش جاری تھی۔نوگیارہ کے حملوں کے بعدافغانستان اورعراق پر حملے میں حکمران مسلم اشرافیہ امریکہ کے ساتھ تھی۔چنانچہ نفرت کا لاوا ایک دفعہ پھر پھٹ پڑا۔دنیا بھر میں مسلمان امریکہ کی نفرت کا شکار ہوگئے۔

بدقسمتی سے نفرت کے اس کھیل میں جو بات فراموش کردی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جوقومیں علم واخلاق میں پست ہوں وہ کتنی ہی نفرت کرلیں، ذلت، رسوائی اورشکست ان کا مقدر ہوتی ہے۔ ان کے صحافی، دانشور، علماء، واعظ اورخطیب نفرت کی آگ جتنی چاہے بھڑکائیں یہ آگ آخرکار ان ہی کے گھر کوجلاتی ہے۔

اس بات کواگرایک تاریخی حقیقت کے طور پر دیکھنا ہےتو دوسوسال تک جاری صلیبی جنگوں

کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہزار برس قبل پوپ اربن دوم نے مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا کر یورپ کا ٹڈی دل اکٹھا کیا اور فلسطین پر چڑھائی کر دی۔ یہ مسلمانوں کا دورِ زوال تھا۔ مگر ٹیکنالوجی میں وہ بہر حال یورپ سے آگے تھے۔ چنانچہ گنتی کے مسلمانوں نے آخر کار یورپی اقوام کی متحدہ قوت کو ذلیل کر کے باہر نکال کیا۔ تاہم یورپ کی خوش قسمتی تھی کہ دو صدیوں کی پٹائی کے بعد انھوں نے سبق سیکھ لیا۔ اس کے بعد ان کی فکری قیادت مسلمانوں کی نفرت سے زیادہ اپنے معاشروں کی اصلاح میں مصروف ہوگئی۔

مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ دو صدیوں کی مسلسل شکستوں اور بربادیوں کے باوجود مسلمان ابھی تک یہ سبق نہیں سیکھ سکے کہ خدا کی دنیا میں نفرت سے کچھ نہیں ہوتا۔ قومی اور تہذیبی غلبے کے لیے تعمیری سوچ اور اصلاحی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسروں کو الزام دینے اور ان کی سازشیں ڈھونڈنے کے بجائے اپنی غلطیاں تلاش کرنا اور علم واخلاق میں پستی کو دور کرنا اصل کرنے کا کام ہوتا ہے۔

تاہم اب جدید تاریخ میں پہلی دفعہ صورتحال بدل رہی ہے۔ مسلمانوں کی فکری قیادت میں پہلی دفعہ ایک نئے عنصر کا ظہور ہوا ہے جو مغرب کی مرعوبیت یا نفرت کے جذبات سے بلند ہوکر زوال کے اصل وجوہات کی نشان دہی کر رہا ہے۔ جو جذبات کے بجائے علم وتحقیق کی بنیاد پر آراء قائم کرنے کا رواج ڈال رہا ہے۔ جو منفی سوچ کے بجائے مثبت سوچ کو فروغ دینے پر یقین رکھتا ہے۔ جو دہشت اور فساد کے بجائے امن اور دعوت کی طاقت پر یقین رکھتا ہے۔ آج گرچہ نفرت پھیلانے والوں کا سودا سب سے زیادہ خریدا جا رہا ہے، مگر زیادہ وقت نہ گزرے گا کہ یہ نئی آواز سب سے زیادہ موثر ہو جائے گی۔ یہی دن مسلمانوں کے عروج کا پہلا دن ہوگا۔

اللہ کیسے پاک ہے؟

قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کی تسبیح یا پا کی بیان کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو کئی مقامات پر اللہ کی پا کی بیان کرنے کا حکم ہوا ہے۔ دین کی سب سے اہم اور بنیادی عبادت نماز کو بھی متعدد مقامات پر تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں یہ ضروری ہے کہ تسبیح یا اللہ کی پا کی بیان کرنے کے مفہوم کو سمجھا جائے تا کہ اس کائناتی ذکر کو جب ہم زبان سے نکالیں تو دل کی ساری کیفیات ہمارے ساتھ ہوں۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ سبحان اللہ کا لفظی مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک ہے۔ یہ گویا عالم کے پروردگار کو ہر اس وصف اور عیب سے بری قرار دینے کا نام ہے جس کی نسبت اس کی طرف درست نہیں۔ ان میں سے پہلی چیز اللہ کو ہر طرح کے شرک سے پاک قرار دینا ہے۔ اس مفہوم میں اللہ کی تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ خدا اس کائنات کا بلاشرکت غیر خالق و مالک ہے۔ اسے کائنات کی تخلیق میں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کا کوئی ساجھی، شریک، باپ، بیٹا، بیوی، ہم سر، ہم جنس نہیں۔ کوئی نہیں جو اس کی ذات، صفات، اختیار، اقتدار اور حقِ اطاعت میں اس کا شریک ہو۔ اپنے وجود، اپنی ہستی، اپنی بقا، اپنی شان اور بادشاہی میں وہ کسی کی مدد و تعاون کا محتاج نہیں۔ سب اُس سے ہیں، وہ کسی سے نہیں۔ ہر چیز اُس کی ملکیت ہے اور ہر ذرہ پر اُسی کی حکومت ہے۔

تسبیح کا دوسرا مفہوم یہیں سے پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا ہی خالق و مالک ہے تو پھر اسی کی عبادت اور بندگی ہونی چاہیے۔ نماز کو اسی مفہوم میں تسبیح کہا گیا ہے کہ یہ اپنے جذبہ عبودیت کو ہر غیر سے ہٹا کر اللہ کے لیے خالص کر دینے کا نام ہے۔

تسبیح کا تیسرا مفہوم تنزیہی ہے۔ یعنی اللہ کی ہستی کو ہر طرح کے نقص، کمزوری، عجز، عیب، تعین، تشبیہ اور تمثیل سے بلند قرار دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان چیزوں کو اپنے مشاہدے اور

تجربے سے سمجھتا ہے۔ایک پھل کو دیکھ کر دوسرے کو اور ایک مویشی کو دیکھ کر دوسرے کو اس پر قیاس کر لیتا ہے۔انسان مادی وجود ہے اور ہر چیز کو مادی جسم کی شکل ہی میں سمجھتا ہے۔انسان ہر شے میں کمزوری کا پہلو تلاش کر لیتا ہے اور بغیر کمزوری اور عیب کے کسی ہستی کا وجود تصور نہیں کرسکتا۔ایسے میں سبحان اللہ کہنے کا مطلب ہے کہ اے اللہ تو میرے احاطہ ادراک سے باہر، تصور سے بلند اور ہر ممکنہ عیب سے پاک ہے۔تو اپنی ذات میں ایک ہی ہے اور تجھ سا کوئی نہیں۔تیرے احاطہ قدرت میں ہر شے ہے اور تو جو چاہے بلا کسی سبب اور وسیلے کے کرسکتا ہے۔

تسبیح کا اگلا مفہوم یہ ہے کہ زندگی میں جو کچھ حوادث پیش آرہے ہیں، ان میں جو ناانصافی یا ظلم وغیرہ کا عنصر نظر آرہا ہوتا ہے وہ بظاہر اللہ کے اذن سے ہوتا ہے، مگر اس میں اس کی کوئی حکمت اور مصلحت ہے۔وہ کبھی کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اور نہ اس کی ذات سے کبھی کسی شر کا ظہور ہوتا ہے۔وہ تو سراپا خیر اور سراپا احسان ہے۔اس مفہوم میں تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ بدترین حالات میں بھی ہمیں اپنے مالک سے کوئی شکایت اور شکوہ نہیں۔

تسبیح کا اگلا مفہوم خدا کی کاملیت کا اقرار ہے۔جب وہی کامل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ناقص ہوں۔مجھ سے خطا کا ظہور ہوسکتا ہے بلکہ ہوتا ہے۔اس لیے سبحان اللہ کا مطلب اب یہ ہوا کہ مجھ سے اپنے عجز اور کمزوری کی بنا پر غلطی ہوگئی، مگر میں بندہ ناقص ہوں، آپ جیسا بے عیب نہیں ہوں۔اس لیے معافی کا مستحق ہوں۔مجھے معاف کردیجیے۔یہی وہ مفہوم ہے جس میں حضرت یونس نے آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کو لاالہ الا انت سبحانک کہہ کر پکارا تھا۔

جو انسان اس پورے شعور کے ساتھ سبحان اللہ کا ذکر کرے گا، آسمان سے لے کر زمین تک کی ہر مخلوق رشک کی نگاہ سے اس بندے یا بندی کو دیکھے گی اور بروز قیامت اس کا اجر میزان کی ہر چیز پر بھاری ہوجائے گا۔

شانِ مسلمانی

پچھلے دنوں انٹرنیٹ پر مصری چینل النہار کی ایک وڈیو بہت مشہور ہوئی جس میں ایک جدید وضع قطع کی لڑکی ایک خاتون اسکالر کا انٹرویو کر رہی تھی۔ یہ خاتون ڈاکٹر نوحا سلفی پس منظر کی تھیں جواب متشکک (Skeptic) ہوچکی تھیں۔ چنانچہ اپنے اس موجودہ پس منظر کی بنا پر انھوں نے مذہب سے متعلق بڑے منفی خیالات کا اظہار کیا۔ مثلاً دوران انٹرویوان خاتون اسکالر نے کہا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتیں، آسمانی وحی کوئی چیز نہیں اور حضرت جبریل کی ہستی بس ایک کہانی سے زیادہ نہیں۔ اسی نوعیت کے کچھ اور خیالات کا بھی انھوں نے اظہار کیا۔

خیر اس انٹرویو کی وجہ شہرت یہ نہیں بنی، اصل چیز جس نے اس انٹرویو کو مقبول کردیا وہ یہ تھی کہ جدید وضع قطع کی اینکر نے خاتون اسکالر سے کچھ سخت سوالات کیے، اسلام سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کیا اور آخر کار اس خاتون کو پروگرام سے ذلیل کرتے ہوئے نکال دیا۔

آج کے مسلمانوں کے جذباتی اندازفکر کی بنا پر ان میں اس طرح کی چیزیں بہت مقبول ہوجاتی ہیں۔ یعنی ایک فیشن ایبل اینکر نے غیر اسلامی خیالات کی بنا پر کسی کو پروگرام سے نکال دیا۔ درحقیقت اس طرح کی چیزیں اسلام کا بدترین تعارف ہیں۔ یہ اسلام کا ایک ایسا تعارف پیش کرتی ہیں کہ گویا اس کے پاس اس طرح کی سطحی باتوں کا کوئی جواب نہیں سوائے اس کے کہ سوال کرنے والے پر گرج برس کر اس کا منہ بند کردیا جائے، اسے قتل کردیا جائے یا نکال دیا جائے۔

اس پروگرام سے کسی کو اگر نکالنا چاہیے تو وہ ٹی وی اینکر ہے۔ اس لیے کہ ایک برس قبل یہ خاتون اینکر ایک مسلم اسکالر کو بلا کر اسی طرح آن ائیر ذلیل کرچکی تھیں۔ وہ عالم اس شرط پر پروگرام میں آئے تھے کہ اینکر اسکارف لیں گی۔ مگر اینکر نے لائیو پروگرام میں اسکارف اتار دیا اور سارے ناظرین کو یہ بتادیا کہ یہ بزرگ جو ہزار پونڈ لے کر اس پروگرام میں آئے ہیں، مجھے

پروگرام سے قبل بغیر اسکارف کے دیکھتے رہے ہیں۔ پروگرام سے قبل عالم کے ساتھ بغیر اسکارف لیے اس اینکر کی عالم کے ساتھ گفتگو بھی دکھائی گئی۔

اینکر اپنے پروگراموں کو مقبول بنانے کے لیے اس طرح کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ خاتون اینکر اگر سنجیدہ ہوتی تو خاتون اسکالر کو پروگرام میں بلانے سے قبل اس کا پس منظر معلوم کرتی۔ پھر کسی معقول صاحب علم سے اس طرح کے اعتراضات کا جواب سمجھ لیتی۔ مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت قرآن مجید میں علمی بنیادوں پر اس طرح ثابت ہے کہ کوئی معقول شخص کسی طرح اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنی کتاب ''قسم اس وقت کی'' میں ان دلائل کو کچھ اختصار سے بیان کیا ہے۔

ان میں سے ایک سادہ ترین دلیل یہ ہے کہ کوئی عام انسان چاہے وہ پیش گوئی کرنے کی کتنی ہی صلاحیت رکھتا ہو، مستقبل کے واقعات اتنی قطعیت سے نہیں بیان کرسکتا جس طرح اللہ کے نبی علیہ السلام نے بیان کیے۔ یہ پیش گوئیاں فرد، قوم اور بین الاقوامی حالات تینوں سے متعلق تھیں۔ مثلاً آپ نے قرآن مجید میں ابولہب کی ہلاکت کی پیش گوئی کی۔ آپ نے اپنی قوم کے متعلق بتادیا تھا کہ جس وقت قوم آپ کو مکہ سے نکالے گی، اس کے بعد وہ خود اس سرزمین میں نہ رہ سکے گی۔ یہ دونوں پیش گوئیاں اس وقت کی گئیں جب مکہ میں مسلمانوں کے لیے جان بچانا دشوار ہو چکا تھا۔ پھر آپ نے رومی سلطنت کی بدترین شکست کے زمانے میں یہ بتادیا تھا کہ وہ عنقریب ایرانیوں پر غالب آجائیں گے۔ یہ سب کچھ بعینہ چند برسوں میں ہو گیا۔ ڈاکٹر نوحا نے کہا تھا کہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصنیف ہے۔ سوال یہ ہے کہ کوئی مصنف مستقبل کا ایسا صاف اور صحیح نقشہ کیسے کھینچ سکتا ہے۔ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کر سکتے ہیں۔

مگر اس خاتوان اینکر نے یہ نہیں کیا۔ اس کے بجائے ایک اسکالر سے بحث کرتی رہی اور

آخرکار اسے پروگرام سے نکال دیا۔ حالانکہ اگر وہ خود معقول جواب نہیں رکھتی تھی تو ڈاکٹر نوحا کے اعتراضات سنتی اور اگلے پروگرام میں کسی اچھے اسکالر کو بلا کر اس سے جواب لے لیتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے رویے مسلمانوں میں اس لیے مقبول ہیں کہ وہ جذباتی ہو جانے، اسلام اور پیغمبر اسلام سے اظہار عشق کرنے اور معترض پر فتوے بازی کرنے اور اسے قتل کر دینے کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس وڈیو کے ذیل میں جو تبصرے آئے ان میں اطمینان سے کہا گیا کہ ڈاکٹر نوحا کو قتل کر دینا چاہیے۔ خود ڈاکٹر نے جو چہرے کا پردہ کیے ہوئے تھی پروگرام کے آغاز میں یہ کہا کہ وہ پردہ خود کو چھپانے کے لیے کیے ہوئے ہے کہ اسے قتل نہ کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام علم و عقل پر اس درجہ میں ثابت شدہ دین ہے کہ اسے کسی معترض کے اعتراض سے کوئی خطرہ نہیں۔ اسلام کو اصل نقصان یہ انداز فکر پہنچا رہا ہے جو بے قابو جذباتیت سے عبارت ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں اسی جذباتی انداز میں بات کرنے والے لوگ بہت مقبول ہیں۔ یہی آج شان مسلمانی بن چکی ہے۔ جبکہ معقولیت کے ساتھ اسلام کی سچائی پیش کرنے والوں کی کوئی قدر و قیمت مسلمانوں کے معاشرے میں نہیں۔

جھوٹے پروپیگنڈے پر صبر

لغویات بے فائدہ اور بے مقصد کاموں کو کہا جاتا ہے۔اسی لیے قرآن مجید میں اہل ایمان کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ وہ لغویات سے دور رہتے ہیں، (المومنون 3:23)۔تاہم قرآن کریم میں لغویات کا ذکر ایک دوسرے پہلو سے بھی آیا ہے۔وہ یہ کہ اہل ایمان جب لغوبات سنتے ہیں تو اسے نظر انداز کر کے باوقار طریقے سے گزر جاتے ہیں (القصص 55:28، الفرقان 72:25)۔ یہی وہ پہلو جس میں قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بات کو جنت کی ایک بہت بڑی نعمت کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اہل ایمان کو وہاں لغویات سننے کو نہیں ملیں گی (الواقعہ 56:25، النبا 35:78، مریم 62:19)۔

اس پہلو سے لغویات سے مراد بیہودہ گوئی، لایعنی تبصرے، غیر متعلق نکتہ آفرینی، طنز واستہزا، الزام تراشی، کذب وافترا، اشارہ بازی، اور برے ناموں سے پکارا جانا سب شامل ہیں۔ اعلان نبوت کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت شروع ہوئی تو کفار مکہ نے دیگر حربوں کے ساتھ ان چیزوں سے بھی مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کی بھرپور کوشش کی۔آج کل کی اصطلاح میں اس کو کسی کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔یہی وہ حالات تھے جن میں ایک طرف اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو صبر و برداشت کے ساتھ اس بیہودگی کو برداشت کرنے کی تلقین کی بلکہ یہ یقین دلایا کہ جنت میں انھیں ایسی فضول چیزوں کو سننے کی زحمت سے بچالیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک داعی کو ہمیشہ اس طرح کی چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔مگر ایسے موقع پر بندہ مومن کا اصل سرمایہ پروردگار کی یہی نصیحت ہوتی ہے کہ اس طرح کی چیزوں کو مکمل نظر انداز کردو۔اس یقین کے ساتھ جیو کے ایک دن آئے گا جب تمھارا مذاق اڑانے والے، تمھیں گمراہ قرار دینے والے خود مذاق بن جائیں گے، (المطففین 83:29-36)

خواب زندگی ہوتے ہیں

خواب دیکھیے ۔ضرور دیکھیے ۔خواب زندگی ہوتے ہیں مگر......مگر کو ابھی چھوڑیے۔اس پر بعد میں بات کریں گے۔ابھی خواب پر بات کرتے ہیں۔

خواب انسان کی عظمت ہے کہ ہر سر بلندی کا پہلا قدم خواب ہوتا ہے۔انسان بڑا نہیں ہوتا، اسے اس کے خواب بڑا بناتے ہیں۔سو خواب دیکھنے چاہییں ۔ بڑے خواب دیکھنے چاہییں ۔تو پھر بڑا خواب کیا ہے؟ بنگلہ، گاڑی،شوہر، بیوی، بچے،عزت،شہرت، دولت ۔یہی ہمارے خواب ہیں۔مگر یہ بڑے خواب کیا ہوں گے، یہ تو خواب ہی نہیں ۔ یہ تو مقدر ہے جو نادان خواب میں دیکھتے ہیں۔مقدر تو جتنا لکھا ہے، جب لکھا ہے مل ہی جائے گا۔پھر ایک روز اچانک پتہ چلے گا کہ یہ زندگی ہی خواب تھی۔'خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا'

فانی انسان کو تو ابدی خواب دیکھنے چاہییں ۔ابدی زندگی کے دیکھنے چاہییں ۔ان خوابوں میں مالک ذوالجلال کے قدموں کی دھوون میں اپنا کوئی مقام دیکھنا چاہیے۔سات آسمانوں کی بادشاہی میں اپنا حصہ دیکھنا چاہیے۔انبیائے کرام کی مجلسوں کی رفاقت دیکھنی چاہیے۔وہ محفلیں دیکھنی چاہییں جہاں فانی انسان چشمہ ابدیت کے کنارے بیٹھ کر عنایت خسروی کے جام پیے گا۔ جہاں حسن ولذت کی ہر حکایت اپنا کمال دیکھے گی۔ جہاں رنگ ونور کی برسات نگاہوں کو منور، نغمہ وآہنگ کا جادو سماعتوں کو مترنم اور بوئے گل کا اعجاز مشام جاں کو معطر کردے گا۔

یہی خواب ہیں۔صرف یہی خواب ہیں۔باقی سراب ہے۔سو خواب دیکھیے ۔اس لیے کہ یہی خواب زندگی ہیں مگر......خواب ہی دیکھتے رہنا موت ہے۔خواب کو دیکھنے کے بعد تعصب کو سولی دینی پڑتی ہے۔خواہش کو مٹانا اور انا کو فنا کرنا پڑتا ہے۔شاید اسی لیے لوگ یہ خواب نہیں دیکھتے۔مگر ایک فقیر بے نوا کے کہنے سے ہی سہی ......خواب ضرور دیکھیے ۔خواب زندگی ہوتے ہیں۔

مجرم اور محبوب

عارف کی مجلس میں موجود کسی شخص کا یہ ایک تحریری سوال تھا۔ عارف نے بلند آواز سے سوال پڑھنا شروع کیا ''جناب آپ جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے نے شادی کو بہت مہنگا اور مشکل جبکہ زنا کو بہت سستا اور ہماری دسترس میں کر دیا ہے۔ میں ایک غیر شادی شدہ نوجوان ہوں۔ غیر محرم خواتین سے بدنگاہی معمول بن چکا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل پر غیر اخلاقی چیزیں بھی دیکھنا معمول میں شامل ہے۔ اسے برا سمجھتا ہوں، مگر خود پر قابو نہیں رہتا۔ کیا کروں؟''

''اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنالیں۔'' عارف نے سوال ختم کر کے بغیر کسی توقف کے جواب دینا شروع کر دیا۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اب معرفت کا دریا بہنا شروع ہو چکا ہے۔ عارف بولتے رہے:

''جذبہ ہمیشہ عقل پر غالب آجاتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے۔ انسان جذبات کی رو میں بہہ کر غلط کام کر جاتا ہے۔ جذبہ پہاڑی دریا ہے۔ آپ اس کو نہیں تھام سکتے ہیں۔ ہاں اس کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ یہی آپ کی طاقت ہے۔ یہی کمزوری آپ کی سب سے بڑی طاقت ہے۔''

عارف نے آخری جملے پر خاص طور پر بہت زور دیا تھا۔

''ان جذبوں میں دو جذبے شدید ترین ہوتے ہیں۔ غصہ اور جنسی خواہش۔ یہ جس وقت ابھرتے ہیں ہر دیوار گرا دیتے ہیں۔ کوئی بند دروازہ ان کی راہ نہیں روک سکتا۔ یہ ہر دروازہ توڑ دیتے ہیں، مگر......اس مگر کے بعد لمحے بھر کا وقفہ آیا۔ وہ پھر گویا ہوئے۔

''مگر دیوار گرنے اور دروازہ ٹوٹنے سے پہلے یا ذرا بعد ایک لمحہ آتا ہے......لازمی طور پر آتا ہے۔ اس لمحے میں دل کی گہرائیوں سے اللہ کو پکاریے۔ اسے بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ کیا نہیں چاہتے۔ عام حالات میں بھی اللہ آپ کی پکار سنتے ہیں۔ مگر آپ کی وش لسٹ

زمین سے آسمان اور آسمان سے عرش تک پھیلے نجانے کتنے فرشتوں سے گزر کر در قبولیت کے سامنے پہنچتی ہے۔ مگر اس لمحے میں آپ کا جذبہ آپ کی پکار میں اتنی تڑپ پیدا کر دیتا ہے کہ یہ پکار ہر دیوار ڈھاتی ہوئی اور ہر دروازہ توڑتی ہوئی سیدھی عرش تک جا پہنچتی ہے۔

پھر در قبولیت بلا تاخیر کھلتا ہے۔ سب سے پہلے شیطان کے ڈنک کو نکال کر سینے کی جلن کو ٹھنڈک سے بدل دیا جاتا ہے۔ پہلے صبر دیا جاتا ہے۔ پھر زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ نعمتیں دے کر شکر کے اسباب پیدا کر دیے جاتے ہیں۔

یاد رکھیے۔ شیطان جذبات کو جال بنا کر آپ کو پھانستا ہے۔ مگر جو یہ فقیر بتا رہا ہے وہ کر لیجیے۔ شیطان کا داؤ اسی پر الٹ جائے گا۔ وہ آپ کو مجرم بنا رہا تھا۔ آپ محبوب بن گئے۔ وہ محروم کر رہا تھا مگر آپ کو دنیا و آخرت میں وہ سب کچھ دے دیا جائے گا جو آپ کے خوابوں سے زیادہ ہوگا۔ جذبہ آپ کی کمزوری ہے۔ اسے اپنی قوت بنا لیجیے۔''

عارف کی بات ختم ہوگئی۔ مگر ان کے الفاظ کی گونج نے ہر خانہ دل کو اس رب کی محبت سے معمور کر دیا تھا جو سراپا شفقت ہے اور جس کی عنایتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔

اپنا نقطہ نظر

دور جدید میں مسلمانوں کی تربیت میں یہ بات شامل ہو چکی ہے کہ اس دنیا میں دو نقطہ نظر ہوتے ہیں۔ ایک اپنا نقطہ نظر اور دوسرا غلط نقطہ نظر۔ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی بات کو سننے، سنجیدگی سے لینے، اس کے دلائل پر غور کرنے، اپنی غلطی کو ماننے، حتیٰ کہ اپنی غلطی کے امکان کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بات پر جمے رہنے کا سبب صرف یہی نہیں کہ انسان دوسروں کی بات سنتا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اسے پہلے دن سے یقین دلا دیا جاتا ہے کہ تم ہی ٹھیک ہو اور باقی سب غلط ہیں۔ حالانکہ اکثر ایسے لوگوں کا علم بالکل معمولی ہوتا ہے۔ وہ علم و تحقیق کی روایت سے سرے سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ وہ زمینی حقائق سے آخری درجے میں لاعلم ہوتے ہیں۔ ان کا کل سرمایہ جہالت پر مبنی اعتماد ہوتا ہے۔

اس انداز فکر میں سکون تو بہت ہے کہ انسان اپنی بات کی کمزوری سامنے آنے پر جس اذیت کا شکار ہو جاتا ہے، غلطی نہ مان کر انسان اس سے جان چھڑا لیتا ہے۔ مگر اس سطحی اور وقتی سکون کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان نہ صرف سچائی سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اپنی غلطی کی اصلاح کے بعد دنیا میں ترقی اور اللہ کی قربت حاصل کرنے کا جو عظیم موقع مل سکتا تھا، وہ اسے کھو دیتا ہے۔ اپنی غلطی مان لینے کے بعد وقتی تکلیف ہوتی ہے، مگر اس کے بعد جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ایسی روحانی اور فکری ترقی ہوتی ہے کہ اس کی سرشاری زندگی بھر نہیں جاتی۔ مگر بدقسمتی سے لوگ اپنے تعصّبات کے پیچھے اس طرح اندھے ہوتے ہیں کہ وہ ہمیشہ لذت اعتراف سے محروم رہتے ہیں۔

اعتراف خدا کی دنیا میں لامحدود ترقی کا راستہ ہے۔ مگر ایک متعصب اور ڈھیٹ آدمی یہ موقع ہمیشہ کے لیے کھو دیتا ہے۔

شیخ صاحب نماز کیا جانیں

مرزا داغ دہلوی (1831-1905) کلاسیکل اردو شاعری کے دور متاخرین کا نمایاں ترین نام ہیں۔ وہ غالب اور میر کی طرح اردو غزل کے اصل امام تو نہیں ہیں، مگر جذبات، بیان اور احساس کی وہ ساری خوبیاں ان کی شاعری میں جمع ہیں جو انھیں اپنے دور کا بہت بڑا شاعر بناتی ہیں۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ اقبال جیسے لوگ ان سے اصلاح لیتے تھے۔

اردو شاعری کو داغ نے متعدد شاندار غزلیں دیں۔ ان کی ایک بہت خوبصورت اور مشہور غزل کا مقطع اردو زبان و ادب کے کس طالب علم کو یاد نہ ہوگا۔

جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

اس غزل کا ایک اور شعر اس طرح ہے:

کب کسی در کی جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

یہ شعر بظاہر ایک دنیا دار شاعر کا اہل مذہب پر ایک طنز ہے، مگر یہ نماز کی حقیقت کو جتنی خوبی سے بیان کرتا ہے بڑا سے بڑا عالمانہ خطبہ بھی یہ کام نہیں کرتا۔ شعر کا سادہ ترین مطلب یہ ہے کہ مذہب کی نمائندگی کرنے والے شیخ صاحب نماز کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے کیونکہ انھوں نے کبھی کسی اور در کے سامنے ماتھا ہی نہیں ٹیکا۔

بظاہر یہ ایک نامعقول اور کسی قدر گستاخانہ بات لگتی ہے کہ کسی نمازی کی نماز پر اس طرح طنز کیا جائے کہ اس نے کبھی کسی اور کے سامنے تو ماتھا ہی نہیں رگڑا تو وہ نماز کو کیا جانے گا۔ مگر درحقیقت یہ شعر کمال خوبی سے اس بات کو بیان کرتا ہے کہ عام نمازیوں کی نماز میں کوئی کیفیت،

کوئی زندگی اور جذبات کی کوئی گرمی اس لیےنہیں ہوتی کہ ان کی نماز ایک یکطرفہ عمل ہوتی ہے۔

جبکہ اپنی حقیقت کی لحاظ سے نماز ایک دوطرفہ عمل ہے۔اس کی مثال ایسی ہے کہ جب کوئی شخص کسی بادشاہ یا بڑے آدمی کے سامنے جا کر اس کے سامنے پیشانی رگڑ نا شروع ہو جا تا ہے تو یہ نفسیاتی سطح پر اس کے لیے بہت بڑا واقعہ ہوتا ہے۔اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی زندہ اور باشعور ہستی کے سامنے سر جھکا رہا ہے اور پیشانی ڈال رہا ہے۔آدمی یہ کام عام حالات میں کرتا ہے نہ عام لوگوں کے سامنے کرتا ہے۔وہ بڑی بے کسی اور بے بسی میں مبتلا ہوکر جب کسی بادشاہ کے حضور پیش ہوتا ہے تو اپنی تڑپ کے اظہار کے لیے اس کے قدموں میں گر جاتا ہے۔کسی کے سامنے پیشانی ٹیکنا اتنا بڑا عمل ہے یہ عمل انسان اگر کسی بت کے سامنے بھی کرے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے اس نے اپنا سب کچھ کسی کے قدموں میں لا ڈالا ہے۔

اس کے برعکس بدقسمتی سے عام نمازی خدا کے سامنے ایسے نماز پڑھتے ہیں کہ گویا وہ تنہا کھڑے ہیں اور سامنے کوئی ہے ہی نہیں۔یہ نماز ایک رسم اور ایک عادت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔مگر درحقیقت نماز جن اعمال کا مجموعہ ہے ان کی حقیقت کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب وہ کسی اور کے سامنے کیے جائیں۔کسی کے سامنے سر جھکانا، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا، دوزانو ادب سے بیٹھ جانا، کمر کے بل جھک جانا اور سب سے بڑھ کر اس کے سامنے ماتھا رگڑ نا تعظیم اور عاجزی کی انتہا ہوتی ہے۔یہ کسی در سے گہری عقیدت، محبت اور اپنی مجبوری اور بے بسی کے بیان کی آخری شکلیں ہوتی ہیں۔مگر ہم سب یہ کام اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسے کرتے ہیں کہ ہماری روح اندر سے ہر احساس سے خالی ہوتی ہے۔ہماری نفسیات پر اس نماز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔اسی لیے داغ کا یہ شعر ہم سب کے بارے میں ٹھیک ہے۔

کب کسی در کی جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

محبت اور خوف

مجھ سے بارہا ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ انسان کے لیے اچھے اعمال کا محرک کیا ہونا چاہیے......اللہ کا خوف یا اللہ کی محبت۔ میں اس بات کا ہمیشہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ جو کہ قرآن مجید ہی کی عملی شکل ہے، کی روشنی میں یہ جواب دیتا ہوں کہ دونوں ہی ضروری ہیں۔خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہر موقع بے موقع اللہ سے ڈرایا جاتا رہے یا ہمہ وقت محبت اور شوق کی بات کر کے خوف خدا سے لوگوں کو بے نیاز کر دیا جائے۔

قرآن مجید اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ بندوں کا رب سے تعلق دونوں پہلوؤں سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ جگہ جگہ قرآن مجید میں ''خوف وطمع کے ساتھ اسے پکارو'' جیسی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشیر یعنی خوشخبری دینے والا اور نذیر یعنی خبر دار کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ جنت کے ذکر سے بھی قرآن مجید بھرا ہوا ہے اور جہنم کے عذابوں کا ذکر بھی کم نہیں ہے۔سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت بھی اہل ایمان کا وصف بیان ہوا ہے اور بن دیکھے ڈرتے رہنے والے بھی ان کی صفت بیان ہوئی ہے۔

ان دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک انسان پر زندگی میں دونوں طرح کے لمحات آتے ہیں۔ اسے نیکیوں کی طرف رغبت بھی ہوتی ہے۔شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات بھی جنم لیتے ہیں۔ ساتھ میں غفلت و فراموشی کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ شہوت اور غضب بھی انسان پر سوار ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں بشارت اور رحمت کی نوید اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور دوسری صورت میں نار جہنم کے شعلے اسے واپس راہ راست پر لاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے بیانات نفسیات انسان کا مکمل جواب ہیں۔

خرابی اصل میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی مصلح قرآن مجید کو معیار بنانے کے بجائے

اپنے ذوق، طبیعت اور مزاج کو بنیاد بنا کر دین کو بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا مزاج شدت پسند ہو تو وہ لوگوں کی ہر غلطی کا ذکر سنتے ہی اپنی زبان سے نار جہنم کے شعلے برسانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ چھٹا نک بھر غلطی کو اٹھاتا ہے اور منوں وزنی جرائم سے متعلق سزا سنا دیتا ہے۔ وہ سد ذریعہ کی نوعیت کے حکم کو لیتا ہے اور اسے ایسے پیش کرتا ہے گویا اسے چھوڑا تو انسان دین کے دائرے سے باہر نکل جائے گا۔

مزاج سہولت پسند ہو تو غفلت و معصیت کی ہر قسم پر بھی ''اللہ معاف کرنے والا'' کہہ کر ایسے رعایت دی جاتی ہے کہ توبہ اور اصلاح کا کوئی خیال ذہن میں نہیں آتا۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے ایسے فضائل سنائے جاتے ہیں کہ انسان عمل صالح کی تمام اقسام سے خود کو فارغ سمجھتا ہے۔ بندوں کے حقوق کی ایسی دہائی دی جاتی ہے کہ نماز روزہ دین سے خارج محسوس ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسری انتہا ہے اور پہلی کی طرح ہی غیر مطلوب ہے۔

بندہ مومن خوف و امید دونوں میں جیتا ہے۔ اس کی امید ایسی ہوتی ہے کہ اگر کائنات میں سے صرف ایک شخص کی معافی کی گنجائش ہو تو اللہ کی رحمت سے وہ خود ہی کو اس کا حقدار سمجھتا ہے اور خوف ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی شخص کے جہنم رسید ہونے کا اعلان کر دیا جائے تو وہ ڈرتا ہے کہ یہ شخص کہیں وہی نہ ہو۔

تاہم عملی طور پر اس میں سب سے اچھی راہ یہ ہے کہ انسان ہر عمل کرنے سے پہلے خوف و اندیشہ میں جیے اور پوری قوت سے بہترین عمل کرنے کی کوشش کرے۔ جب بہترین کوشش کر لے تو اللہ پر بھروسہ رکھے کہ اس سے بڑھ کر عالی ظرف اور رحمدل ہستی کوئی نہیں۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے عمل کا بدلہ پہاڑ کے برابر دینے والا ہے۔ یہ امید اور اندیشہ اور خوف و رجاء ایمان میں وہ حسن پیدا کرتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اختلاف رائے کے آداب

اس دنیا میں انسان ایمان وفکر کے جس امتحان میں ہے اس میں لوگوں میں اکثر اختلاف رائے رونما ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاف ہر مذہبی اور غیر مذہبی معاملے میں ہوتا ہے۔ ایسے میں چند آداب ہیں جن کا ابتدائی شعور بھی ہمارے ہاں لوگوں کو نہیں ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگ سنگین نوعیت کے اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کا جاننا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ لوگ اختلاف رائے کے وقت فوراً سے پیشتر کسی بھی شخص کی نیت، عمل کے محرکات، ایمان، اخلاص اور قلبی کیفیات کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ جو بھی ہو یہ اخلاقی اعتبار سے بدترین جرم ہے۔ اس کی سنگینی کا عالم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ وعید کی ہے کہ کسی شخص نے اپنے بھائی پر کفر کا الزام لگایا تو یا وہ اپنی بات میں ٹھیک ہے ورنہ جھوٹا ہونے کی شکل میں اس کا اپنا ایمان سلب کر لیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں کسی کو الفاظ سے کافر کہنا ہی شامل نہیں، کسی بھی ایسے کام کی نسبت کرنا جو کوئی کافر ہی کر سکتا ہے، کہنے والے کے لیے قیامت کے دن ایسے ہی سنگین نتائج پیدا کر دے گا۔

بدقسمتی سے یہ ہمارا عام رویہ ہے کہ فرقہ وارانہ اختلاف میں ہم اطمینان سے لوگوں کو کافر کہتے ہیں۔ فکری و علمی اختلاف کی شکل میں کسی بھی شخص کو اطمینان کے ساتھ دشمنوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کفر کے الزام کی دوسری شکل ہے۔ ہم کسی کو بدنام کرنے کے لیے اس کے اعمال کے محرکات، قلبی کیفیات اور نیت کو اس طرح زیر بحث لاتے ہیں کہ گویا ہم پیغمبر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں وحی کر کے بتا رہے ہیں کہ کسی نے کوئی کام کیوں کیا ہے۔ ان میں سے ہر رویہ روز قیامت ذلت و جہنم کی جس آگ میں ہمیں دھکیلے گا، اس کا ہلکا سا اندازہ بھی کسی کو ہو جائے تو ساری زندگی وہ لکھنا اور بولنا چھوڑ دے۔

اختلاف رائے میں ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس مفروضے سے بات شروع کرتے ہیں کہ ہم آخری درجے کے حق پر کھڑے ہیں اور سامنے والا باطل ہے۔ جس طرح کسی کے دل کا حال صرف اللہ جان سکتا ہے، اسی طرح حق پر صرف اللہ کے پیغمبر کھڑے ہوتے ہیں۔ باقی لوگ سب انسان ہیں اور ہمیشہ امکان ہوتا ہے کہ خود کو درست سمجھنے کے باوجود وہی غلطی پر ہوں۔ اس لیے اختلاف رائے کی شکل میں اپنی بات دلیل سے بیان کر دینا چاہیے۔ اس سے آگے بڑھ کر کسی سے اختلاف رائے کی شکل میں اس کے خلاف مہم چلانا یا اسے مجبور کرنا کہ ہماری بات صحیح مانو ورنہ اسے بدنام کرنا، اسے طعن و تشنیع اور نفرت کا موضوع بنانا وغیرہ غیر اخلاقی رویے ہیں جس کی جوابدہی اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوگی۔

اختلاف رائے میں تیسری چیز یہ ہے کہ اکثر لوگ علم اور تربیت کے بغیر پورے اعتماد سے گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ادب اور زبان کے اسالیب کو گہرائی میں نہیں سمجھتے اور پورے اعتماد سے کلام کے معنی پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ حذف، تخصیص، ایجاز جیسی باریک باتوں کو نہیں سمجھتے، مگر کسی دوسرے کے کلام پر ایسے فیصلہ دیتے ہیں جیسا کہ وہ اس موضوع پر اتھارٹی ہوں۔ بعض اوقات لوگ پوری علمی روایات کی طرف سے گفتگو کرتے ہیں، اسلاف کے موقف کی ترجمانی کرتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ علم کی روایت اور اسلاف کا نقطہ نظر ان کے خلاف ہے۔ یہ چیزیں جس شخص میں ہوں اسے نہ کوئی بات سمجھائی جا سکتی ہے نہ وہ کبھی اپنی غلطی مان سکتا ہے۔ البتہ دوسرے پر پورے اعتماد سے فیصلے ضرور دے سکتا ہے۔

اگلا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کبھی دیانت داری سے دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ ہمارا اصل مسئلہ اپنی انانیت کا جھنڈا گاڑنا ہوتا ہے۔ سامنے والا لاکھ کہے کہ میں یہ بات نہیں کہہ رہا جو آپ بیان کر رہے ہیں۔ مگر معاملہ بات سمجھنے سمجھانے کا نہیں بلکہ فتح و شکست کا ہوتا ہے یا کسی کو

بدنام کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے بارہا ایک غلط بات کسی کی طرف ٹھونسی جاتی ہے اور پھر اس کی بنیاد پر کسی کے صحیح و غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

یہ سب چیزیں جب جمع ہو جاتی ہیں تو بدتہذیبی، غیر شائستگی، الزام و بہتان جیسی چیزیں خود بخود کلام کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ سب اپنی ذات میں خود ایک منفی عمل ہے جو دوسرے کو تو کم مگر ناقد کو زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔

اس لیے اختلاف اور تنقید کا درست طریقہ یہ ہے کہ دیانت داری سے کسی شخص کی پوری بات اور نقطہ نظر کو سمجھا جائے۔ اعتراض کرنے سے پہلے سوال کر کے بات کو سمجھنے کا عمل کیا جائے۔ معاملہ علمی ہے تو اعتراض اٹھانے سے پہلے اس موضوع پر نمایاں اہل علم کا نقطہ نظر سمجھا جائے تاکہ ہمارا اعتراض کہیں ہماری جہالت کا آئینہ دار نہ بن جائے۔ متعلقہ شخص موجود ہو تو اس سے اس کی بات کا مطلب سمجھ لیا جائے۔ اگر وہ کوئی وضاحت دے تو قبول کر لی جائے۔ اگر اس کی بات ہمارے نزدیک قابل قبول نہ ہو تب بھی اسے اپنی رائے رکھنے کا حق دیا جائے۔ تنقید کرنی ہو تو فرد یا گروہ کے بجائے نقطہ نظر پر کی جائے۔ اس میں بھی لب و لہجہ شائستہ رکھا جائے۔ کسی فرد یا گروہ کو بدنام کرنے کے بجائے اس کے حوالے سے وہی بات کہی جائے اور اسی طرح کہی جائے جس طرح وہ خود بیان کرتا ہو۔

جب اختلاف اس طرح کیا جائے گا تو کبھی فساد میں نہیں بدلے گا بلکہ علم کی روایت میں ترقی ہوگی۔ معاشرے میں نئے خیالات کا فروغ ہوگا۔ باہمی محبت اور رواداری معاشرے میں امن و خیر خواہی کا ماحول فروغ پائے گا۔ یہ نہیں ہوگا تو سماج میں نفرت اور بدامنی کا ماحول فروغ پاتا رہے گا۔ لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہیں گے اور کافر قرار دیتے رہیں گے۔ اس سارے ماحول میں علم اور دعوت دین دونوں کی موت واقع ہو جائے گی۔

انسانی پالوشن

جدید تمدن کا ایک بہت بڑا مسئلہ پالوشن (Pollution) ہے۔ یہ مسئلہ صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہوا ہے۔ جب انسان کی بنائی ہوئی مشینوں سے نکلنے والا دھواں اور مختلف قسم کے کیمیکل وغیرہ نے ہوا، مٹی اور پانی کو مختلف قسم کی آلودگیوں یا پالوشن سے بھر دیا ہے۔ یہ آلودگیاں انسانی صحت اور ماحول دونوں کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکی ہیں۔ اس خطرے پر قابو نہ پایا گیا تو اس کرہ ارض پر انسان کا مستقبل بہت تاریک ہو جائے گا۔ چنانچہ دنیا بھر میں آلودگیوں کو کم کرنے اور قابو میں رکھنے کے لیے شعور سازی اور قانون سازی کی جا رہی ہے۔

انسانی معاشروں کے لیے آلودگی کی ایک اور قسم بھی شدید نقصان کا باعث ہے۔ یہ آلودگی خارج کے بجائے انسانوں کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ آلودگی منفی اندازِ فکر سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کے اندر نفرت اور مایوسی کی شکل میں اپنا ظہور کرتی ہے۔

مایوسی کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ انسان سے عمل کا جذبہ چھین لیتی ہے۔ وہ اسے خود غرض اور مفاد پرست بنا دیتی ہے۔ ایسا شخص دن کی روشنی میں کھڑا ہو کر اندھیرا دیکھتا، ساحلِ سمندر پر گھٹن محسوس کرتا اور دریا کے کنارے پیاس سے تڑپتا رہتا ہے۔ جبکہ نفرت انسان سے ہمدردی، خیر خواہی، نرمی اور رحمدلی جیسی اعلیٰ صفات چھین لیتی ہے۔ نفرت کا مریض آگ اگلتا، فساد پھیلاتا، عداوت اور جھگڑے میں اپنی توانائیاں خرچ کرتا اور نتیجتاً معاشرے کو ظلم و فساد سے بھر دیتا ہے۔

انسان کی زندگی امید اور محبت کی آکسیجن پر منحصر ہے۔ نفرت اور مایوسی کے مریض ان دونوں سے محروم ہوتے اور دوسروں کو محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خود پالوشن کا شکار ہوتے ہیں اور صحافت، دانشوری اور مذہب کے نام پر معاشرے میں بھی اسی پالوشن کو پھیلاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی باتوں پر توجہ دینے کا نتیجہ نفسیاتی مریض بننے کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔

معرفت کیا ہوتی ہے؟

''معرفت کیا ہوتی ہے؟'' آج عارف کی مجلس میں گفتگو کا آغاز ایک صاحب کے سوال سے ہوا تھا۔ جواب میں عارف کی دلپذیر آواز بلند ہوئی۔

''معرفت علم کا کمال ہے۔علم کا سفر جب شروع ہوتا ہے تو اضطراب، شک، سوال، تردید اور تصحیح کی منازل سے گزرتا ہے۔ پھر علم احساس کی وادی میں قدم رکھتا ہے اور آخر کار یقین کے اس پڑاؤ پر ڈیرہ ڈالتا ہے، جسے معرفت کہتے ہیں۔''

''کسی مثال سے سمجھائیں؟'' یہ کہتے ہوئے ان صاحب کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔

''اللہ تعالیٰ کی صفت الوھاب کا مطلب کیا ہے؟'' عارف کے سوال پر جواب آیا:

''دینے والا، عطا کرنے والا۔''

''درست فرمایا آپ نے۔ یہ علم ہے۔مگر جس وقت یہ علم اس احساس میں ڈھل جائے کہ پروردگار میری ہر ضرورت کی چیز دے سکتا ہے۔ اس یقین میں ڈھل جائے کہ اس لمحے بھی میرا رب اپنی دست عطا دراز کیے کسی خالی جھولی کا منتظر ہے۔ کیوں نہ میں ہی اپنی جھولی پھیلائے اس کی بارگاہ میں پہنچ جاؤں۔ اور اس کے بعد آپ کا وجود سراپا دعا بن جائے۔تو پھر یہ علم معرفت میں تبدیل ہو گیا۔

اس لمحے میں آپ کے دل کی آنکھیں آپ کو یہ منظر دکھادیں گی کہ ہر سوالی جھولی بھر کر چلا گیا۔ سخی داتا کے خزانے ختم نہیں ہوئے۔ مانگنے والے ختم ہو گئے، مگر وہ ابھی بھی پکارے جا رہا ہے کہ ہے کوئی سوالی۔ یہ پکار سن کر آپ کو حوصلہ ہوا اور آپ بھی دست طلب دراز کیے دربار اقدس میں آ گئے۔اس نے آپ پر نگاہ تبسم فرمائی اور خالی جھولی بھر دی۔ بس یہی احساس معرفت ہے۔ یہی یقین معرفت ہے۔'' عارف کی صدا تھم گئی، معرفت کا ایک اور دریچہ سننے والوں پر کھول گئی۔

ذرہ اور خلا

اگر کبھی آپ کا جانا شہر کی روشنیوں سے پاک کسی صحرائی یا پہاڑی علاقے میں ہوا ہو تو رات کی تاریکی میں آپ نے آسمان کے ہر گوشے کو تاروں سے پٹا ہوا دیکھا ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بظاہر ایک دوسرے سے بالکل ملے ہوئے ان تاروں کے درمیان کھربوں میل کا خلا پایا جاتا ہے۔ اس بات کو یوں سمجھیں کہ سورج کا زمین سے فاصلہ تقریباً نو کروڑ میل ہے۔ جبکہ سورج کے بعد جو قریب ترین ستارہ پایا جاتا ہے وہ تقریباً 250 کھرب میل کے فاصلے پر ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کائنات میں ستاروں کی حیثیت ذروں کی سی ہے اور ان کے درمیان موجود فاصلہ اور خلا ہمارے تصور اور گمان سے کتنا زیادہ ہے۔

یہ عالم اکبر کا معاملہ تھا۔ جبکہ عالم اصغر کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ ایک زمانے تک ایٹم کو سب سے چھوٹی چیز اور مادہ کی بنیادی اکائی سمجھا جاتا تھا۔ تاہم اس کے بعد سائنس کی ترقی نے یہ بتایا کہ ایٹم متعدد چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنتا ہے۔ پہلے الیکٹرون، نیوٹرون اور پروٹون کی نشاندہی ہوئی اور بعد میں کئی اور ذرات سامنے آئے۔

ایٹم اور یہ تمام ذرات اتنے چھوٹے ہیں کہ سر کی آنکھ سے دیکھنا تو دور کی بات ہے، تصور کی آنکھ سے بھی ان کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم بطور مثال اگر ہائیڈروجن کو لیا جائے جو کہ کائنات میں سب سے زیادہ پایا جانے والا عنصر ہے تو اندازہ کیجیے کہ سوئی کی نوک پر ہائیڈروجن کے تقریباً پچاس کھرب ایٹم سما سکتے ہیں۔ اب تصور کیجیے کہ اجرام فلکی کے بیچ میں کھربوں میل کا جو خلا پایا جاتا ہے اس کو سوئی کی نوک پر سما جانے والے پچاس کھرب ایٹم بھرنا شروع کر دیں تو ان کی تعداد کتنی زیادہ ہوگی؟

پھر جیسا کہ بیان ہوا کہ خود ایٹم بھی بنیادی ذرہ نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے بہت سے ذرات پر

مشتمل ہے۔ اس کے مرکز میں ایک نیوکلس (Nucleus) ہوتا ہے جس میں پائے جانے والے ذرات نیوٹران اور پروٹان کو ابتدائی سائنس کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ جبکہ نیوکلس کے اردگرد الیکٹرون گردش کررہے ہوتے ہیں۔ ایٹم کے سائز سے مراد مرکزی نیوکلس اور اردگرد موجود الیکٹرون کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔ نیوکلس اور الیکٹرون کے بیچ کا تمام تر علاقہ خلا پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر ایٹم کو ایک فٹ بال کے میدان کے برابر تصور کرلیا جائے، تو وسط میں ایک انگور کے برابر نیوکلس ہوگا اور میدان کی باؤنڈری لائن پر سوئی کی نوک جتنے چھوٹے الیکٹرون ہوں گے۔ جبکہ بیچ میں پوری جگہ خالی پڑی ہوتی ہے۔ اس کا سادہ ترین مطلب یہ ہے وہ مادہ جو جگہ گھیرنے والے ایٹم سے مل کر بنتا ہے بیشتر خلا ہی ہوتا ہے۔ اس خلا کو بھرنے کے لیے پہلے الیکٹرون کو ایٹم کا فٹبال کے میدان جتنا علاقہ بھرنا ہوگا اور پھر کہیں جا کر یہ ایٹم کائنات کے خلا کو بھریں گے۔ یوں ایٹم کو بھرنے والے الیکٹرون کی تعداد اور پھر کائنات کو بھرنے والے ایٹم کی تعداد ہر شمار اور اندازے سے باہر ہے۔

یہ ساری تفصیل بیان کرنے کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا کو سمجھانا ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ جب رکوع سے کھڑے ہوتے تو ربنا ولک الحمد (اے ہمارے مالک حمد تیرے لیے ہی ہے) کہتے اور پھر فرماتے کہ تیری حمد آسمانوں اور زمین بھر کے ہو اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ بھر کے اور اس کے بعد جو تو چاہے وہ بھر کر تیری حمد ہو (سنن ابوداؤد: رقم 760)۔

یہ دعا آج کی جدید سائنس کا علم رکھنے والا کوئی شخص جب اس علم کے ساتھ پڑھے گا جو اوپر بیان ہوا تو اسے اندازہ ہوگا کہ زمین بھر کا مطلب دراصل ہے کیا۔ پھر وہ اگر یہ بھی جانتا ہو کہ کائنات لامحدود طور پر بڑی ہے جس میں مادہ بہت کم اور بیشتر خلا پایا جاتا ہے تو وہ اس خلا کے بھرنے کے تصور سے لرز اٹھے گا۔ اسے احساس ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل کس

خوبی سے یہ بیان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ درحقیقت کس قسم کی حمد کے حقدار ہیں۔

سچ یہ ہے کہ اللہ کی حمد کسی گنتی اور کسی تصور میں نہیں آ سکتی۔ ہاں اس کا قریب ترین اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ نے الیکٹران، نیوٹران اور پروٹران اور ان ہی جیسے چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنائی ہے۔ یہ اپنی گردش میں اللہ کی حمد کرتے ہیں۔ مگر ان ذرات میں اور ان سے بننے والے اجرام فلکی کے بیچ میں لامتناہی خلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ خلا بے مقصد نہیں چھوڑا گیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی مومن ایسے ہی اللہ کی حمد کرتا ہے جیسے اوپر بیان ہوا تو اس لمحے کائنات میں موجود تمام ذرات بڑھتے ہیں اور ہر خلا کو اللہ کی حمد سے بھر دیتے ہیں۔ یہی وہ حمد ہے جو درحقیقت اللہ کا حق ہے۔

مگر بدقسمتی سے بہت کم لوگ ہیں جو اللہ کی ایسے حمد کرتے ہیں جیسا کہ اس کی حمد کا حق ہے۔ اول تو لوگوں کو غیر اللہ کی تعریفوں سے فرصت نہیں۔ کبھی اللہ کی حمد کی بھی تو بے معنی، رٹے رٹائے اور جذبات اور فہم سے عاری کچھ الفاظ کے ساتھ۔ مگر جب کبھی کوئی مومن اپنے آقا کی پیروی میں اس طرح اللہ کی حمد کرتا ہے تو اس لمحے کائنات کے سارے ذرات لامحدود خلا کو بھر کر اللہ کی حمد کرتے ہیں۔ یہ حمد ہر تصور، ہر مثال اور ہر تعداد سے بلند ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے جو انسان حمد کا یہ لمحہ تخلیق کر سکتا ہے، وہی سب سے بڑھ کر اس عظیم موقع سے غافل ہے۔

عالم اور اعتماد

ایک عالم اور محقق وہ شخص ہوتا ہے جو علم کی روایت کے تمام پہلوؤں سے واقف ہوتا ہے اور پھر کسی معاملے میں اپنے فہم کے مطابق ایک رائے قائم کرتا ہے۔ عالم کا علم اور تحقیق اسے اس بات کا حقدار بناتے ہیں کہ وہ اپنی بات پورے اعتماد کے ساتھ بیان کرے اور دوسرے اہل علم کی غلطی کو واضح کرے۔ یہ ایک عالم کا حق ہے جو اس سے چھینا نہیں جا سکتا۔ مگر اس سے جو توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے نیت پر حملہ نہ کرے، ان کا تمسخر نہ اڑائے اور اس بات کے لیے تیار رہے کہ اس کی غلطی اگر اس پر واضح کر دی جائے تو وہ اپنی رائے سے رجوع کر لے گا۔ معاملات اگر یوں رہیں تو کبھی تعصب پھیلے گا نہ فرقہ واریت وجود میں آئے گی۔

خرابی اس وقت ہوتی ہے جب وہ لوگ کسی معاشرے میں عالم بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو علم کے صرف ایک پہلو سے واقف ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے علاوہ کسی اور نقطہ نظر کو سنجیدگی اور کھلے دل سے پڑھا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ درحقیقت جن بزرگوں کے نام پر وہ کھڑے ہوتے ہیں وہ ان کی علمی وراثت اور استدلال سے بھی واقف نہیں ہوتے۔

ایسے لوگ عملی زندگی میں اتر کر کبھی کسی دوسرے کا نقطہ نظر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر کبھی دوسروں کی بات سننا بھی پڑے تو ہمدردی سے سمجھنا تو دور کی بات ہے وہ سنتے ہوئے بھی بات کا جواب سوچتے رہتے ہیں۔ یہی یکطرفہ علم بلکہ کم ترین علم کے حاملین پھر فروعی اور جزوی اختلاف کی بنیاد پر دوسرے اہل علم کی نیت بلکہ ایمان کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

یہی پہلے اور دوسرے گروہ کا حقیقی فرق ہے۔ پہلا گروہ صاحبان علم کا ہوتا ہے جو علم کی پوری روایت سے واقف ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ علم کی روایت سے تو کیا اپنے بزرگوں کی علمی روایت سے بھی واقف نہیں ہوتا۔ پہلا گروہ اگر پورے اعتماد سے کسی چیز کی تردید کر رہا ہوتا ہے تو اس کے

پیچھے ان کی علم اور تحقیق ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ جب پورے اعتماد سے کسی کی تردید کرتا ہے تو اس کے پیچھے گروہی عصبیت کارفرما ہوتی ہے۔ پہلا گروہ ایک نئی اور مختلف بات کو بھی ہمیشہ توجہ سے سنتا ہے کہ وہ پہلے ہی علم کی روایت میں بہت سے نئی اور مختلف باتوں سے واقف ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ ایک نئی اور مختلف بات سنتے ہی متوحش ہوجاتا ہے کہ اس نے ساری زندگی اپنے نقطہ نظر کے علاوہ کوئی دوسری بات سنی ہی نہیں ہوتی۔

پہلا گروہ بھی گرچہ اپنی رائے کے دفاع کے لیے تیار رہتا ہے، مگر جانتا ہے کہ اس کی رائے غلط ہوسکتی ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ اپنی رائے کو آخری حق سمجھ کر دفاع کرتا ہے۔ پہلا گروہ انسانی علم اور فہم کی محدودیت کا شکار ہوکر غلطی کرسکتا ہے، مگر واضح دلیل آنے پر اپنی رائے سے رجوع کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ دوسرا گروہ خود کو نبی اور رسول کے مقام پر سمجھتا ہے اور اپنے فہم کو وحی الٰہی خیال کر کے کسی ترمیم و تبدیلی کو کفر و ایمان کا مسئلہ بنا دیتا ہے۔

ایک عام آدمی کے سامنے دونوں گروہوں کے لوگ بظاہر دین کے نمائندوں کے طور پر آتے ہیں۔ مگر یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دو طرح کے لوگوں میں فرق کرنا سیکھے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ لہجے کے اعتماد سے دھوکہ نہ کھائے۔ بلند و بالا دعوؤں سے مرعوب نہ ہو۔ وہ سوال کرے اور جواب چاہے۔ وہ دریافت کرے اور دلیل مانگے۔ علما کو انسان سمجھے، نبی نہ بنائے۔

اس دنیا میں عالم اور عامی دونوں امتحان میں ہیں۔ عالم کا امتحان یہ ہے کہ علم کے تمام پہلوؤں سے ابتدائی واقفیت سے قبل کلام نہ کرے اور غلطی واضح ہوجانے پر اپنی رائے سے رجوع کرلے۔ عامی کا امتحان یہ ہے کہ وہ دونوں فریقوں میں فرق کرنا سیکھے اور علما کو نبی اور ان کی آراء کو ایمانیات نہ بنائے۔ وہ دوسرے اہل علم کو بدنام کرنے کی مہم نہ چلائے۔

علم روشنی ہے جو نظر آجاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ تعصّبات کی عینک اتار کر دیکھا جائے۔

یہ تو کیڑے ہیں

یہ کئی برس پرانا واقعہ ہے۔ میں اپنے بھائی کے دوست سے ملنے گیا جن کا ہمارے خاندان سے بہت گہرا تعلق تھا۔ یہ ایک سادہ مزاج، دیندار اور کاروباری شخصیت تھے۔ اتفاق سے اس وقت کراچی کے سابقہ میئر عبدالستار افغانی مرحوم ان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ ہمارے دوست مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑے جوش و جذبے سے میرا تعارف افغانی صاحب سے کرانے لگے۔ اس تعارف کا ایک جملہ مجھے نہیں بھولتا جو اس طرح تھا۔ ''یہ تو کیڑے ہیں۔''

یہ بظاہر ایک بڑے آدمی کے سامنے میری بے عزتی تھی، مگر درحقیقت یہ میری تعریف تھی۔ ہمارے دوست دراصل میرے علمی ذوق کو بیان کرنا چاہ رہے تھے۔ اس کے لیے جو تعبیر انھوں نے اختیار کی وہ کتابی کیڑے کی تھی اور شدت جذبات میں اس تعبیر سے کتابی کا لفظ رہ گیا۔ یوں جملہ یہ ادا ہوا کہ یہ تو کیڑے ہیں۔ چنانچہ ان کی اس بات کا میں نے کوئی برا نہیں مانا اور افغانی صاحب بھی بغیر کسی وضاحت کے سمجھ گئے کہ وہ کہنا کیا چاہ رہے تھے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ ان صاحب سے ہم واقف تھے۔ جن لوگوں سے ہم واقف ہوتے ہیں، ہم کبھی ان کے سرسری الفاظ، ظاہری رویے، کسی خاص واقعے سے ان کا تاثر نہیں لیتے ہیں۔ بلکہ ان کی مجموعی شخصیت اور مثبت خصوصیات کی بنیاد پر ان کی باتوں اور کاموں کا مقصد متعین کرتے ہیں۔ یہی مثبت کردار کی خوبی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس منفی کردار کا حامل شخص ایک شکاری کی طرح ان لوگوں کی تاک میں بھی لگا رہتا ہے جن کا اس سے برسہا برس کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ ہر سیدھی بات میں بھی منفی پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ جہاں دو آراء قائم کی جاسکتی ہیں وہاں ہمیشہ منفی چیز دیکھتا ہے۔ اور بالفرض کوئی ''یہ تو کیڑے ہیں'' جیسی بات سامنے آجائے تو وہ پوری قوت سے سامنے والے پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ تعلق خاطر کی ہر جہت کو کونے میں رکھ کر اپنا بدلہ چکا تا ہے اور یوں انسانی تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت اجتماعی تعلقات کی بقا کا راز لوگوں سے حسن ظن رکھنا اور مثبت بنیادوں پر معاملات کو دیکھنا ہے ورنہ دنیا کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہ سکتا۔

سابقین اور بعد والے

”اے ہمارے رب ہماری بخشش فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے ایمان میں سبقت لے گئے اور ہمارے دلوں میں ان اہل ایمان کے لیے کوئی کدورت نہ پیدا کیجیے گا۔ اے ہمارے رب تو بہت رؤف و رحیم ہے۔“ (الحشر 59:10)۔

قرآن مجید کی یہ دعا اس تعلق کا بڑا خوبصورت بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کے درمیان مطلوب ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے حوالے سے جو ایمان کی سمت دوڑ لگا رہے ہوں۔ اس دوڑ میں جو لوگ سبقت لے جاتے ہیں وہ بلاشبہ بڑے مرتبے کے لوگ ہوتے ہیں۔ جیسے نزول قرآن کے وقت مہاجرین اور انصار کا معاملہ تھا۔ ابتدا ہی سے کسی خیر کی طرف متوجہ ہو جانا بڑے مرتبے کی بات ہوتی ہے۔ جیسے جیسے دعوت پھیلتی ہے یہ سابقین اہل ایمان کسی نہ کسی پہلو سے نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ایسے میں امکان یہ ہوتا ہے کہ بعد میں ایمان لانے والے، ان قدیم الایمان لوگوں کو اپنا حریف سمجھ بیٹھیں۔ وہ دیکھیں کہ وسائل پر بھی یہی لوگ قابض ہیں، نام بھی ان کا ہی ہو رہا ہے، خدمات بھی ان کی ہی سراہی جا رہی ہیں۔ جس کے بعد وہ ان کی ساری جدوجہد، قربانیوں اور ایثار کو بھول کر منفی سوچ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے بچانے کے لیے اہل ایمان کی یہ دعا ہمیشہ کے لیے قرآن مجید کا حصہ بنا دی گئی۔

یہ دعا بتاتی ہے کہ بعد میں آنے والے سابقین کے احتساب کے مقام پر کھڑے ہونے کے بجائے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں۔ ان کی کوئی کوتاہی نظر آئے تو ان کے لیے بھی معافی کی درخواست کرتے ہیں۔ اپنے دلوں کو عداوت کی آماجگاہ بنانے کے بجائے کینہ و کدورت سے بچاتے ہیں۔ یہی لوگ بلاشبہ پیچھے ہونے کے باوجود اجر میں سابقین کے ساتھ آ کھڑے ہوں گے۔

نگاہِ یار سلامت ہزار مے خانے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آج سے چار ہزار برس پرانا ہے۔ انھوں نے پورے مشرق وسطیٰ کے علاقے میں گھوم کر لوگوں کو ایک اللہ کی طرف بلایا۔ مگر سوائے ان کی بیوی سارہ اور بھتیجے لوط علیہما السلام کے ان پر کوئی ایمان نہیں لایا۔ پیروکاروں کی تعداد کے لحاظ سے انسانی تاریخ میں کسی مشن کی اس سے بڑی ناکامی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی انبیا و رسل کے مشن بھی ایسی ہی ظاہری ناکامی سے دوچار ہوئے ہیں۔

انبیا کے پاس یہ راستہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے جذبات بھڑکا کر، ان کے تعصّبات ابھار کر اور ان کی خواہشات کی پیروی کر کے لوگوں کی بھیڑ اکٹھی کریں اور مقبول لیڈر بن جائیں۔ مگر وہ ایسا کبھی نہیں کرتے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان کے زمانے میں یہود رومیوں کے خلاف شدید نفرت کا شکار تھے۔ سیاسی آزادی ان کا مشن تھا۔ ظاہری اعمال ان کا اصل دین تھا۔ آنجناب نے ان میں سے ایک چیز کو بھی سند جواز دینے سے انکار کر دیا۔ اس رویے پر شدید تنقید کی یہاں تک کہ یہود آپ کی جان کے درپے ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ حضرات انبیاء کیوں مقبولیت اور لیڈری کا یہ راستہ اختیار نہیں کرتے۔ کیوں وہ لوگوں کی نفرت اور دشمنی کے کانٹے سمیٹتے رہتے ہیں۔ اس کا سادہ ترین جواب یہ ہے کہ ان کی نگاہ اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا اصل مشن لوگوں کی بھیڑ اکٹھی کرنا نہیں سچائی کی شمع روشن کرنا ہے۔ ان کا مسئلہ مقبولیت نہیں، ہدایت ہوتا ہے۔ ہدایت لوگوں کے جذبات اور خواہشات کا نہیں اللہ کی مرضی کا نام ہے۔ اس راستے پر چل کر لوگ نہیں ملتے تو کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ تو مل جاتا ہے۔ جو لوگ مئے توحید کے نشہ سے سرشار ہوں ان کے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہوتی۔

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت ہزار مے خانے

اللہ کی پناہ

اس دنیا میں انسان ہمیشہ مختلف خطرات کی زد میں رہتا ہے۔ان خطرات سے بچنے کے لیے انسان جتنی بھی کوشش کرلے، بہرحال غفلت یا بے خبری میں انسان کبھی نہ کبھی ان کا نشانہ بن جاتا ہے۔انسان کا یہی وہ عجز ہے جس کی بنا پر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے اپنے پروردگار کی مدد و پناہ حاصل رہے۔قرآن مجید کی آخری دوسورتیں یعنی فلق اور ناس جنھیں ملا کر مُعَوِّذَتَین کہا جاتا ہے، انسان کے اسی عجز کا جواب ہیں۔

صحیح احادیث کے مطابق جب یہ سورتیں نازل ہوئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبصرہ فرمایا کہ ان جیسی آیات پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں (مسلم: رقم، 1181-1183)۔آپ کا یہ معمول تھا کہ رات سوتے وقت تین دفعہ سورۃ لاخلاص کے ساتھ یہ دونوں سورتیں پڑھتے اور دونوں ہاتھوں پر پھونک کر پورے جسم پر پھیر لیتے ،(بخاری: رقم، 5017)۔حفاظت کے پہلو سے ان سورتوں کے اور بھی متعدد فضائل روایات میں بیان ہوئے ہیں۔

جب ان دوسورتوں کے مضامین کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ ان میں اس اعلیٰ طریقے سے اللہ کی پناہ طلب کی گئی ہے کہ اس سے بہتر طریقہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا تھا۔یہ حقیقت اس وقت اور واضح ہوجائے گی جب یہ بات سامنے رہے کہ انسانی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ایک جسمانی اور دوسرا نفسیاتی۔پہلی سورت یعنی سورۃ الفلق انسان کے جسمانی وجود اور دوسری سورۃ الناس اس کے نفسیاتی وجود کو ہر قسم کے نقصان دہ اثر سے بچاتی ہے۔

پہلی سورت میں ''رب الفلق'' کی پناہ مانگی گئی ہے۔فلق کا لفظی مطلب پھاڑنا ہوتا ہے۔اس سے عام طور پر صبح مراد لی جاتی ہے۔کیونکہ صبح کے وقت دن کی روشنی تاریکی کے پردے کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔تاہم یہاں ''رب الفلق'' سے مراد صرف صبح نہیں بلکہ ہر چیز کا پھاڑ کر

نکالنے والا ہے۔اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے لیے فالق الاصباح (الانعام 96) کے الفاظ قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں۔اور اسی پس منظر میں فالق الحب والنویٰ (الانعام 95) کے الفاظ آئے ہیں یعنی دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا۔مراد اس سے تخلیق کرنا یا پیدا کرنا ہے۔کیونکہ دنیا میں ہر چیز کسی نہ کسی چیز کا پردہ یا خول پھاڑ کر اس طرح نمودار ہوتی ہے کہ ایک وجود دوسرے وجود سے برآمد ہوتا ہوا صاف محسوس ہوتا ہے۔جیسے تمام حیوانات رحم مادر یا انڈے سے اور نباتات گٹھلی اور دانے کو پھاڑ کر نمودار ہوتے ہیں۔یا پھر جیسے صبح کی مثال گزری جو رات کا پردہ پھاڑ کر نکلتی ہے۔چنانچہ اسی خالق کا سہارا لے کر تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کو خالق کہنے کے بجائے ''رب الفلق'' کیوں کہا گیا۔ہمارے نزدیک یہی وہ صفت ہے جس کا سمجھنا پناہ اور تحفظ کی حقیقی نوعیت کو واضح کر دیتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ''رب الفلق'' بول کر یہاں تخلیق کے اس مرحلہ آغاز کو سامنے کر دیا گیا ہے جب ایک وجود جسمانی طور پر کمزور ترین حالت میں ہوتا ہے۔

اپنی تخلیق کے ابتدائی مرحلے پر ہر مخلوق چاہے حیوانات ہوں یا نباتات، انتہائی کمزور ہوتی ہے۔مگر یہ ''رب الفلق'' ہی ہے جو اس کمزور وجود کا سہارا بنتا ہے۔وہ ہر خطرے اور اندیشے سے اسے بچا کر وجود کامل بنا دیتا ہے۔یوں صبح کی سفید دھاری دن کی روشنی میں ڈھل جاتی ہے، ناتواں بچہ مرد کامل بن جاتا ہے اور نرم و لطیف کونپل توانا درخت کا روپ دھار لیتی ہے۔چنانچہ ایک بندہ مومن کو یہ سکھایا گیا ہے کہ اگر پناہ چاہنی ہے تو اسی ''رب الفلق'' کی چاہو جو ہر ناتواں کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

تمام مخلوقات کے شر سے عمومی پناہ مانگنے کے بعد اس ''رب الفلق'' کی پناہ تین ان مواقع پر مانگی گئی ہے جب انسان اپنی بے خبری کی بنا پر اپنے دفاع کے قابل نہیں ہوتا۔پہلی رات کے

اندھیرے میں جب تاریکی کے ساتھ نیند کی بے ہوشی انسان کو ہر طرح کے خطرات چاہے کیڑا کانٹا ہو یا چور ڈاکو، ان سب کے لیے آسان شکار بنا دیتی ہے۔ دوسری جادو ٹونہ کرنے والوں کے شر سے جو بے خبری میں انسان پر وار کرتے ہیں اور تیسری اس حاسد کے حسد سے جس کے دل کا حال انسان نہیں جان سکتا۔

یہ انسان کے جسمانی وجود کی حفاظت کا انتظام تھا۔ دوسری سورت یعنی سورۃ الناس انسان کے نفسیاتی وجود کا تحفظ کرتی ہے۔ اس تحفظ کی ضرورت دراصل اس وسوسہ انگیزی کے خلاف ہوتی ہے جو شیاطین جن وانس انسان کے دل ودماغ میں کرتے ہیں۔ انسان اس وسوسہ انگیزی، پروپیگنڈے، خیالات اور توہمات سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ وسوسہ ڈالنے والے شیاطین، لیڈر اور ساتھی تو عام طور پر اپنا کام کر کے پیچھے ہو جاتے ہیں اور انسان ان کے اثر سے ایسے کام کرنے لگتا ہے جو اس کی دنیا اور آخرت دونوں کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔

وسوسہ انگیزی کا یہ فتنہ جسمانی ضرر سے اتنا زیادہ سنگین ہوتا ہے کہ ”رب الفلق “ کی ایک صفت کے برعکس یہاں اللہ کی تین صفات یعنی انسانوں کے رب، بادشاہ اور معبود کی پناہ لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ انسان زمانہ قدیم سے تین طاقتور ہستیوں کی انھی تین قسموں سے واقف رہا ہے جو اسے تحفظ دیتی رہی ہیں۔ وہ اگر غلام ہے تو اس کا مالک یا رب معاشرے کے دوسرے لوگوں سے، وہ رعایا ہے تو اس کا بادشاہ دوسرے ملکوں، قوموں اور باشاہوں سے اور بحیثیت ایک بندے کے اس کا معبود اسے ساری مخلوقات کے شر سے بچاتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کے اصل مالک، بادشاہ اور معبود ہیں۔ چنانچہ جب ان کی پناہ مانگی گئی تو ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے غلام، اپنی رعایا اور اپنے بندے کو بچانے نہ آئیں۔ اور جب وہ بچانے آجائیں تو کسی کی کیا مجال کہ وہ اپنے شر سے ایسے غلام کو نقصان پہنچا سکے۔

الٹا چاند

یہ ایک تجربہ ہے جو قمری مہینے کے بیشتر ایام میں کیا جا سکتا ہے لیکن مہینے کی سات اور اکیس تاریخ اس تجربے کے لیے بہترین ہیں۔ان دو تاریخوں میں چاند بالکل آدھا نظر آ رہا ہوتا ہے۔ سات تاریخ کو آپ آسمان پر نظر ڈالیں اور چاند کو غور سے دیکھیں۔ چاند انگریزی زبان کے حرف D کی مانند نظر آئے گا۔یعنی اس آدھے چاند کا روشن حصہ دائیں طرف ہوگا۔ یہی تجربہ قمری مہینے کی اکیس تاریخ کو دہرائیں تو اب آپ کو چاند انگریزی حروف تہجی کے C کی مانند نظر آئے گا۔یعنی اس کا روشن حصہ بائیں آ چکا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہینے کے نئے چاند یا ہلال کے ساتھ جب چاند کا دائرہ بڑھنے لگتا ہے تو اردو کے حرف د سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ پھر بتدریج روشن چاند کا دائرہ داہنی سمت سے بھرتا ہے اور سات تاریخ کو انگریزی کے حرف D کی طرح نصف روشن ہو جاتا ہے۔ چودھویں کو چاند مکمل دائرے کی شکل میں بھر جاتا ہے اور اس کے بعد داہنی سمت ہی سے چاند کا روشن حصہ کم ہونے لگتا ہے۔اکیس تاریخ کو یہ حرف C کی طرح آدھا رہ جاتا ہے۔مگر سات تاریخ کے چاند کے برعکس اس آدھے چاند کا پیٹ دائیں کے بجائے بائیں طرف ہوتا ہے۔اور پھر اسی سمت میں یہ کم ہوتا ہوا غائب ہو جاتا ہے۔

اگر آپ زمین کے نصف جنوبی کرے (Southern Hemisphere) کے کسی ملک جیسے آسٹریلیا یا نیوزی لینڈ میں موجود ہیں تو یہ تحریر پڑھتے ہوئے آپ میرے مشاہدے کو بالکل غلط قرار دیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے جھوٹی معلومات فراہم کرنے والا ایک دھوکے باز شخص سمجھیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ آپ میرے بیان کردہ طریقے کے مطابق چاند کو ساتویں اور اکیسویں شب کو دیکھیں گے تو چاند بالکل برعکس جگہ پر ہوگا۔یعنی ساتویں کو وہ C اور اکیسویں کو D کی مانند ہوگا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ بھی ٹھیک ہیں اور میں بھی غلط نہیں۔ میرے جیسے وہ تمام لوگ جو زمین کے شمالی نصف کرے (Northern Hemisphere) پر بستے ہیں، وہ چاند کو ایسا ہی دیکھتے ہیں جیسا میں نے بیان کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چاند زمین کے مرکز یا خط استوا کے گرد گردش کرتا ہے۔ خط استوا (Equator) کے شمال میں واقع لوگوں کو وہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے جیسا کہ وہ خط استوا کے جنوب میں واقع لوگوں کو نظر آتا ہے۔ یوں دونوں خطوں کے لوگ ایک ہی حقیقت کو مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔

انسانی زندگی میں جو اختلافات پیش آتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جہاں فرق صحیح اور غلط اور حق و باطل کا ہوتا ہے۔ تاہم اکثر اوقات دونوں فریق اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوتے ہیں۔ لیکن وہ معاملے کو اپنے اپنے زاویے اور اپنے اپنے مقام سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات ایک ہی حقیقت بالکل مختلف بلکہ متضاد نظر آتی ہے۔ یوں اختلاف رائے بلکہ بارہا فساد، لڑائی جھگڑے اور تعلقات کی خرابی کی نوبت آجاتی ہے۔

اس اختلاف کی ایک مثال مسلمان فقہا کے مابین ہونے والا اختلاف رائے ہے۔ یہی معاملہ ساس بہو کے جھگڑے کا ہے۔ اس میں بھی دونوں فریق اکثر اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر معاملات کو دیکھتے ہیں اور نتیجے کے طور پر اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے اختلافات کو رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے شخص کا زاویہ نظر سمجھا جائے۔ اگر معاملہ حق و باطل کے بجائے زاویہ نظر کا ہے تو یہ مان لیا جائے کہ اس معاملے میں ایک سے زیادہ رائے قائم کرنا ممکن ہے۔ اگر معاملہ ساس بہو کی طرح عملی نوعیت کا ہے تو پھر زاویہ نظر کے اختلاف کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فریق دوسرے کی رعایت کرے۔ اس سے درگزر کرے۔ یہ نہ ہو سکے تو کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ایسے مسائل حل کیے جاتے ہیں جس میں ہر فریق کچھ نہ کچھ پیچھے ہٹتا ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا راستہ اختلاف کو فساد میں بدل دیتا ہے۔

اڑنے والا گھوڑا

پچھلے دنوں انٹرنیٹ پر ایک وڈیو دیکھی ۔ یہ ایک طوفانی رات کی وڈیو تھی جس میں مکہ کی فضاؤں میں ایک اڑتے ہوئے گھوڑے کے منظر کو ریکارڈ کرلیا گیا تھا۔ بجلی کی چمک اور کڑک میں گھوڑا اڑ رہا ہے اور ساتھ میں لوگ سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ کبر کہہ رہے ہیں۔

یہ وڈیو جنگل کی آگ کی طرح مشہور ہوگئی اور ہر طرف لوگ اسے اسلام کی سچائی کا ثبوت قرار دینے لگے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ جدہ میں کھلونوں کی دکان پر رکھا ایک گھوڑا تھا۔ اس میں گیس بھری تھی اور ایک ڈور کی مدد سے اسے ہوا میں اڑایا جاتا تھا۔ طوفانی ہوا میں ڈور ٹوٹ گئی اور یوں گھوڑا واقعی اڑنے لگا۔ لوگوں نے یہ منظر اور اس کی وڈیو بنا کر نیٹ پر ڈال دی۔ پھر جدہ مکہ بن گیا اور اسلام کی حقانیت ایک نئے پہلو سے ثابت کردی گئی۔

اس طرح کے واقعات نہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں ہر سنی سنائی بات بلا تصدیق آگے بڑھانے کا کتنا ''ذوق'' ہے بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں مسلمان اپنی کتاب قرآن مجید سے کس درجہ میں ناواقف ہیں جو ہوا میں اڑتے ہوئے گھوڑوں کے بجائے زمین پر چلنے والے گھوڑوں اور ہوا میں اڑتے پرندوں کو اپنی حقانیت کا ثبوت بنا کر پیش کرتا ہے۔ بلا شبہ زمین پر چلنے والے گھوڑے اور ہوا میں اڑتے پرندے ایک عظیم معجزہ ہیں، مگر چونکہ یہ معمول کے واقعات ہیں، اس لیے کوئی نہیں جو ان کو دیکھ کر سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی خدا کی کتاب قرآن مجید توہمات کی نہیں علم کی کتاب ہے۔ اس میں گھوڑوں اور پرندوں پر ہی نہیں بلکہ شہد کی مکھی اور صحرا کے اونٹ سے لے کر زمین و آسمان کی ہر نشانی پر تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ ان چیزوں کا ہونا خدا کے ہونے اور تنہا رب ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں چلنے والے گھوڑوں، اڑنے والے پرندوں اور زندگی کی ہر قسم کا ہونا ایک معجزہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم جن چلنے والے گھوڑوں اور اڑنے والے پرندوں کو دیکھتے ہیں، وہ ایک ایسی کائنات کے باسی ہیں جو ہر اعتبار سے زندگی کی ہر قسم کے لیے ایک قاتل کائنات ہے۔ آج کا انسان یہ بات سب سے بڑھ کر جانتا ہے کہ اس کائنات میں زیادہ تر وہ مہیب خلا ہے جہاں نہ سانس لینے کو آکسیجن ہے، نہ پینے کو پانی ہے، نہ کھانے کو غذا ہے۔ اس خلا میں اگر سیارے ہیں تو ان کا درجہ حرارت اتنا کم ہے کہ زندگی کی ہر قسم کو وہ فوراً ختم کر دے گا۔ اگر چٹانیں ہیں تو زندگی کی ہر قسم کے لیے موت کا پیغام ہیں۔

باقی کائنات ستاروں یا بلیک ہول پر مشتمل ہے۔ ستارے اتنی گرم اور ایسی خوفناک آگ اگل رہے ہیں کہ ان سے لاکھوں میل کے فاصلے پر موجود ہر گھوڑے، انسان اور پرندے کی ہڈیاں بھی پگھل جائیں گی۔ جبکہ بلیک ہولز مادہ کی ہر شکل ہی کو نہیں روشنی اور توانائی کو بھی اپنے اندر نگل کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہاں زندگی کا کیا سوال۔ اس کے علاوہ بھی کائنات میں اگر کچھ ہے تو زندگی کی ہر قسم کے لیے اس کا مطلب موت کے سوا کچھ اور نہیں۔

یہ ہے وہ کائنات جس میں استثنائی طور پر کرہ زمین پایا جاتا ہے۔ کائنات کے اس قبرستان میں زندگی کا یہ گہوارا تن تنہا کھڑا اپنے خالق و مالک، اپنے حاکم و ناظم اور رب مہربان کا زندہ تعارف بن کر کھڑا ہے۔ اس کرہ ارض پر پانی ہے۔ یہاں ہریالی ہے۔ کھلی فضا ہے۔ سمندر اور دریا ہیں۔ زرخیز مٹی اور برف سے لدے پہاڑ ہیں۔ حیات کی باقی اقسام کو چھوڑیئے یہاں زمین پر چلنے والے گھوڑے ہیں اور آسمان پر اڑنے والے پرندے ہیں۔ پھر یہاں قرآن مجید ہے جو لوگوں کے سامنے ان چلنے والے گھوڑوں اور اڑنے والے پرندوں کو بطور نشانی پیش کرتا ہے۔

آہ! مگر یہ بدنصیب حاملین قرآن اڑنے والے پرندوں اور زمین پر چلنے والے گھوڑوں کو

دیکھتے ہیں اور چیخیں مار کر نہیں روتے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہوتے۔ ان کی زبان سے سبحان اللہ، لاالہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے الفاظ نہیں نکلتے۔ وہ اڑتے ہوئے گھوڑے تلاش کرتے اور ان کو اسلام کی سچائی کا ثبوت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کوئی ان عقلمندوں سے پوچھے کہ کسی روز ایسا کوئی گھوڑا اگر واقعی نظر آ گیا اور ویٹ کن میں نظر آ گیا تو کیا مسیحیت سچا مذہب بن جائے گی؟ ہمیں جان لینا چاہیے کہ اسلام توہمات کی نہیں، علم کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ اس کی دعوت ایک ایسے دور کے لیے ہے جب علم سچائی کی بنیاد بن چکا ہے۔ جدید انسان اب توہمات کی نہیں علم کی بنیاد پر جیتا ہے۔ اور قرآن مجید اس کی طلب کا بہترین جواب ہے۔

مگر بدقسمتی سے سر دست یہ قرآن مجید بغیر سمجھے پڑھنے کے کام آتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب مسلمان قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنا شروع کر دیں۔ جس کے بعد وہ اڑنے والے گھوڑوں کے بجائے چلنے والے گھوڑوں میں خدا کی عظمت کو تلاش کریں گے اور اسے دنیا کے سامنے بیان کریں گے۔ مسلمانوں کو یہ کرنا ہوگا۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ وہ یہ نہیں کریں گے تو غیر مسلم خدا کا انکار کر کے مسلمانوں کی دنیا اور اپنی آخرت دونوں خراب کرتے رہیں گے۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

ٹیپ ریکارڈر

ٹیپ ریکارڈر دورِ جدید کی اہم ترین ایجادات میں سے ہے۔ آج کے جدید آلات کے بعد تو یہ اپنی اصل قدر و قیمت کھو چکا ہے، مگر بیسویں صدی میں یہ تفریح کا اہم ترین ذریعہ تھا۔ لوگ اپنی پسند کا میوزک، قوالیاں، تقریریں وغیرہ ریکارڈ کرواتے اور روزانہ ان کو سنا کرتے۔

یہ ٹیپ ریکارڈر بظاہر تو ایک مشین ہے لیکن یہ ایک خاص قسم کے انسانوں کا بہترین تعارف بھی ہے۔ یہ انسان اپنے تعصّبات کے اسیر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہر مجلس، ہر محفل اور ہر فورم پر ٹیپ ریکارڈر کی طرح چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ٹیپ ریکارڈر کی طرح ون وے کمیونیکیشن (communication) کا آلہ بن جاتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں سنتے اور کچھ نہیں سمجھتے۔ بس بولتے، بولتے اور بولتے چلے جاتے ہیں۔

آپ ان کے نقطہ نظر کی غلطی کتنے ہی مدلل طریقے پر ثابت کر دیں۔ ان کے انداز فکر کی کجی کتنی ہی مثالوں سے واضح کر دیں۔ کتنے ہی معقول طریقے پر ان کے استدلال کے بخیے ادھیڑ دیں، آپ یہ دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے کہ آپ نے انھیں جہاں پر چھوڑا تھا یہ وہیں سے اپنی گفتگو شروع کریں گے۔ ایسا لگے گا کہ انھوں نے کچھ نہیں سنا۔ اگر مجبوراً سنا تو کچھ سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ صم بکم عمی فھم لا یرجعون۔

یہ رویہ کوئی اور اختیار کرے تو قابل درگزر ہے، مگر جب ایک مسلمان مذہبی شخص اپنے تعصّبات کی بنا پر اس طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ قیامت کے دن اپنی معافی اور درگزر کے تمام امکانات ختم کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید جگہ جگہ اس کو کفار کے رویے کے طور پر بیان کرتا ہے اور اسی کو ان کے جہنم میں جانے کا سبب قرار دیتا ہے، (الملک 10:67)۔

حقیقت یہ ہے کہ حاملین قرآن کا جو گروہ بھی ٹیپ ریکارڈر کی سطح پر زندگی گزارے گا، وہ اپنے آپ کو جہنم کے عذاب کے لیے پیش کر رہا ہے۔

نیت اور شہادت

جنگ احد تین ہجری میں لڑی گئی۔اس جنگ میں ابتداء میں مسلمانوں کا پلا بھاری تھا مگر پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کی خلاف ورزی کے نتیجے میں ستر مسلمانوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔قرآن مجید نے سورہ آل عمران (140:3) میں ان لوگوں کو شہداء قرار دے کر حیات ابدی کی نوید سنائی (169:3)۔

اس جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے قزمان نامی ایک جنگجو نے حصہ لیا۔وہ اس جنگ میں بے مثل بہادری کے ساتھ لڑا۔قریش کے تین علمبرداروں سمیت اس نے تن تنہا آٹھ کفار کو ہلاک کر دیا۔جنگ کے بعد وہ اس حال میں ملا کہ زخموں سے چور چور تھا۔اسے جنت کی خوشخبری سنائی گئی تو بولا کہ میں دین کے لیے نہیں بلکہ اپنی قوم کی عزت کے لیے اور اس لیے لڑا ہوں کہ قریش کے قدم ہماری زمین کو پامال نہ کرسکیں۔اس کے بعد اس نے شدت تکلیف سے خودکشی کر لی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے کہ وہ جہنمی ہے۔یہ پوری تفصیل ابن اسحاق،ابن ہشام اور ابن کثیر نے اپنی کتابوں میں بیان کی ہے۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کس کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے اور کون اسے مار رہا ہے،اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔حتیٰ کہ جنگ کرنے والا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کا عظیم شرف حاصل کر رہا ہو اور اسے مارنے والے وہ کفار مکہ ہوں جن کے کفر پر قرآن گواہ ہے تب بھی اصل اہمیت اپنی نیت کی ہوتی ہے۔اگر اس کی نیت نصرت دین کے بجائے اپنی قبائلی اور قومی تعصب کے لیے لڑنے کی ہو،خدا کے دشمنوں کے بجائے اپنی قوم کے دشمنوں کے خلاف لڑنے کی ہو تو اس کی موت رائگاں اور اس کی جنگ بے کار ہے۔اس کا انجام وہی ہوگا جو قزمان کا ہوگا۔

جینے کی سطح

انسان ایک انتہائی حیرت انگیز دنیا میں آنکھ کھولتا ہے۔اس دنیا کی سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کرہ ارض کو چھوڑ کر یہاں ہر جگہ موت کا راج ہے۔ پوری کائنات میں زندگی کی ایک رمق بھی نہیں پائی جاتی۔مگراس کرہ ارض پر زندگی لاکھوں انواع کی شکل میں اپنا ظہور کرتی ہے۔ زمین پر پائی جانے والی زندگی کی تقریبا 87لاکھ اقسام میں سے انسان وہ واحد نوع ہے جو بیک وقت عقل، وجدان اور ذوق جمال رکھتا ہے۔

ان تینوں کے ساتھ جب انسان دنیا پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے ہر طرف تنظیم و ترتیب، مقصدیت اور جمال وکمال نظر آتا ہے۔سورج،سمندر،فضا،ہوا،بادل،پہاڑ اور زمین مل کر حیرت انگیز طور پر انسان کی غذا کو تخلیق کرتے ہیں۔ یہ غذا گھاس پات نہیں ہوتی بلکہ ان گنت ذائقوں کے پھل،سبزی،اناج اور پھر گوشت، دودھ،مرچ مصالحوں کا ختم نہ ہونے والا دسترخوان بچھا دیتا ہے۔پھر انسان کے ذوق جمال کی تسکین کے لیے پھول سبزہ، چاند ستارے، صبح وشام،رنگ وروشنی،روپ اور خوشبو کی لامحدود دنیا آباد ہے۔

اس دنیا میں جینے کی ایک سطح جانور کی ہے۔ یہ کھانے پینے اور نسل کشی میں لگے رہنے کی سطح ہے۔دوسری سطح فرشتوں کی سطح ہے۔یہ صرف تسبیح وعبادت کی سطح ہے۔تیسری سطح انسان کی ہے۔ یہ نعمتوں پر حمد کے نغمے گانے،شکر گزاری کرنے،گناہ سے رکنے اور مشکلات پر صبر کرنے کی سطح ہے۔اس سطح کا انسان اس دنیا کے حسن ولذت سے لطف اندوز ہوتا اور تڑپ کر مالک کا شکر ادا کرتا ہے۔ یہ نافرمانی سے رکتا اور رب کے لیے نفس کے تقاضوں کو دبا دیتا ہے۔ یہ مشکل پر اللہ کی رضا کے لیے حق پر ثابت قدم رہتا ہے۔یہی وہ سطح ہے جس پر جینے کا بدلہ لامحدود جنت ہے۔یہی وہ سطح ہے جس پر جینے والے بہت کم ملتے ہیں۔

حجامت

آج کی نشست میں عارف اپنا ایک واقعہ سنا رہے تھے جو کل شب انھوں نے حجام کی دکان پر دیکھا تھا۔ سامعین پوری توجہ سے ان کی بات کو سن رہے تھے۔

''بچے کی عمر یہی کوئی ایک برس ہوگی۔ اس عمر کے بچوں کی معصومیت تو ویسے ہی دل موہ لیتی ہے، مگر یہ گول مٹول اور سرخ وسفید بچہ اور بھی پیارا لگ رہا تھا۔ مگر اِس وقت وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اس کے دادا اسے گود میں بٹھائے ہوئے تھے اور حجام بڑی تیزی اور مہارت سے اس کے بڑھے ہوئے بالوں کو کاٹنے میں مصروف تھا۔ حجام کے کہنے پر دادا نے بچے کے دونوں ہاتھ بھی پکڑ لیے کہ اس کی مزاحمت حجام کی قینچی کا رخ بالوں سے ہٹا کر اس کی جلد یا سر کی طرف نہ کر دے۔

اس پر بچے کی آہ وفغاں میں اور اضافہ ہو گیا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دادا نے اپنی گرفت کم نہیں کی ۔ وہ ہنسا کر، باتیں کر کے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے رہے، مگر بچہ روتا رہا۔ آخر کار حجامت ختم ہوئی۔ بچہ فوراً چپ ہو گیا۔ مگر اب اس کی خوبصورت شکل تراشے ہوئے بالوں کے ساتھ اور نکھر گئی تھی۔ یہ وہ فرق تھا جو بچے کے علاوہ ہر شخص کو سمجھ میں آ گیا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ بچہ بھی یہ بات سمجھنے لگے گا۔''

یہ آخری جملہ کہتے ہوئے عارف مسکرانے لگے اور پھر بولے:

''حجامت کا یہ واقعہ ایک دوسرے پہلو سے ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ پیش آتا ہے۔ زندگی میں ایک سے زیادہ مواقع پر ہماری ''حجامت'' شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ''حجامت'' کبھی دکھ اور بیماری کے ہاتھوں ہوتی ہے تو کبھی تنگی ومحرومی کے ذریعے سے۔ کبھی حالات کی ستم ظریفی کا نتیجہ ہوتی ہے تو کبھی اپنے اور بیگانوں کے ہاتھوں سے دیے گئے زخم اس کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ حجامت جب بھی ہوتی ہے، ہم بے چین ہو جاتے ہیں۔ تڑپتے اور روتے ہیں۔ مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی بلکہ بارہا حالات کے آہنی ہاتھ اس طرح ہمیں اپنی گرفت میں لیتے ہیں کہ ہر مزاحمت

کا امکان ختم کر دیتے ہیں۔

بے کسی اور بے بسی کے ان لمحوں میں ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتا۔ کوئی دلاسہ کافی نہیں ہوتا اور کوئی تسلی دل کو سکون نہیں دیتی۔ قرار لٹ جاتا ہے اور چین کی دنیا برباد ہو جاتی ہے۔ بے سکونی اور بے صبری کے ان لمحوں میں نہ دعا کام آتی ہے، نہ وظیفے مسئلہ حل کرتے ہیں۔ لیکن معصوم بچے کی حجامت کا یہ سبق یاد رہے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دکھ، یہ بیماری، یہ پریشانی، یہ محرومی زندگی کے عارضی واقعات ہیں۔ ان کا مقصد ہمیں بہتر بنانا ہوتا ہے۔''

محفل پر سناٹا طاری تھا۔ اگر کوئی آواز تھی تو معرفت کی اس بہتی آبشار کی تھی۔

''انسانی زندگی عام حالات میں خوشیوں اور نعمتوں سے عبارت ہوتی ہے۔ مگر اکثر انسانوں کو نعمتیں، غفلت اور معصیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ چیزیں انسان کے اخلاقی وجود کو مکروہ اور بدصورت بنا دیتے ہیں۔ دنیا والوں کو شاید یہ اخلاقی مکروہ پن محسوس نہ ہو، مگر رب کریم کا حسن لازوال اپنے بندوں کو ایسی غلاظت میں لتھڑا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی شفقت جوش مارتی ہے۔ وہ حالات کو قینچی بنا کر اپنے لونڈی غلاموں کی حجامت کر دیتا ہے۔ یہ حجامت اپنوں ہی کی ہوتی ہے۔ غیروں کو تو وہ اخلاقی نجاستوں کی دلدل ہی میں چھوڑ کر بے پروا ہو جاتا ہے۔

اس لیے جب زندگی میں ''حجامت'' شروع ہو تو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ عارضی مرحلہ ہے۔ جلد گزر جائے گا۔'' بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک صاحب بول اٹھے۔

''مگر میں تو کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری ایسی حجامت ہو۔ کیا اس کا بھی کوئی نسخہ ہے؟''

''ہاں ہے اور بہت آسان نسخہ ہے۔ اپنے اخلاقی وجود کی گہری نگہداشت کریں۔ اسے حرص، ہوس، تکبر، نفرت، تعصب، غفلت سے دور رکھیں۔ کثرت سے اللہ کے حضور استغفار کرتے رہیں۔ یقین جانیں پھر آپ پر ہمیشہ بہت ہلکا ہاتھ رکھا جائے گا۔''

محفل تمام ہوئی اور معرفت کا ایک اور سبق سننے والوں کے دلوں پر نقش ہو گیا۔

اوپن ڈیفنس

اعلیٰ تعلیم کی سند جاری کرنے سے پہلے تعلیمی ادارے مختلف قسم کے امتحانات لیتے ہیں۔ان میں سے ایک طریقہ اوپن ڈیفنس کا ہے۔یہ امتحان عام طور پر پی ایچ ڈی یا ایم فل کی ڈگری دینے سے قبل لیا جاتا ہے جس میں امیدوار کو اس شعبے کے ماہرین اور طلباء کے سامنے اپنے مقالے کا دفاع کرنا ہوتا ہے۔اس طریقہ امتحان میں حاضرین میں سے کوئی بھی شخص مقالہ نگار سے اس کے مقالے کے حوالے سے کوئی بھی سوال یا اعتراض کرسکتا ہے اور اسے اپنے نقطہ نظر اور کام کا دفاع کرنا ہوتا ہے۔

دنیا میں جانچ کے جتنے طریقے رائج ہیں، یہ طریقہ قیامت کی اس پیشی سے سب سے زیادہ قریب ہے جس کا سامنا ہم میں سے ہر شخص کو قیامت کے دن کرنا ہے۔اُس روز مقالے کی جگہ ہمارا اعمال نامہ ہوگا۔ماہرین فن اور طلبا کی جگہ اولین تا آخرین پوری انسانیت تماشائی ہوگی اور خاص ہم سے متعلق لوگ اردگرد موجود ہوں گے۔انبیائے کرام اور شہدا گواہی کے لیے موجود ہوں گے۔ان کے پیغام کی بنیاد پر ہمارے اعمال نامے کا احتساب شروع ہوگا۔ایمان پرکھا جائے گا۔اخلاق دیکھے جائیں گے۔اعمال کی جانچ ہوگی۔

کسی کا حق مارا ہوگا تو وہ سوال کرنے کھڑا ہوجائے گا۔کسی پر الزام و بہتان لگایا ہوگا تو وہ اپنا مقدمہ لے کر آجائے گا۔کسی کی جان مال عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا ہوگا تو وہ بھی اپنا بدلہ مانگنے آجائے گا۔ پھر رسوائی شروع ہوگی۔پکڑ کا آغاز ہوگا۔بدبختی کا فیصلہ ہوگا اور جہنم کے دروازے اس شخص پر کھول دیے جائیں گے۔ہاں جس نے توبہ کی،معافی مانگی،۔اسے جنت کی ڈگری دے دی جائے گی۔

ہم میں سے ہر شخص کو اس ''اوپن ڈیفنس'' سے گزرنا ہے۔یہ بات یاد رکھ کر جس نے زندگی گزاری وہ سرخرو ہوگا۔جو بھولا وہ جہنم کا ایندھن بن جائے گا۔

مذہب کا المیہ

''مذہب کا اصل المیہ کیا ہے، کیا کوئی صاحب بیان کر سکتے ہیں؟'' عارف نے سوال دہرایا۔ مگر خاموشی رہی۔ اس سے پہلے کئی جواب دیے جا چکے تھے، مگر عارف نے کسی جواب پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آخر کو وہ خود ہی جواب دینے لگے۔

''مذہب ایک عقلی دعوت ہے۔ مگر سانحہ یہ ہے کہ مذہب کی اس عقلی دعوت کے حصے میں معقول لوگ نہیں آتے بلکہ اکثر و بیشتر جذبات کے مارے ہوئے لوگ اسے اپنی دلچسپی کا موضوع اور اپنی زندگی بنا لیتے ہیں۔ یہی مذہب کا اصل المیہ ہے۔''

لوگوں کے لیے یہ جواب حیرت انگیز تھا۔ اس حیرت کو ان کے چہروں پر پڑھا جا سکتا تھا۔ ایک صاحب سے رہا نہ گیا۔ وہ سوال کر بیٹھے۔

''مگر اس کا سبب کیا ہے؟''

''سبب یہ ہے کہ عام طور پر لوگ مذہب کو بطور ایک سماجی ورثہ اپناتے ہیں جو ماں باپ اور ماحول سے خود بخود مل جاتا ہے۔ اپنی وراثت سے انسان کا جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ یوں مذہب سے ایک جذباتی تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔''

''مگر یہ المیہ کیسے بن گیا؟'' ایک اور صاحب نے سوال کیا تو عارف بولے:

''المیہ اس لیے بن جاتا ہے کہ ایسے لوگ معاشرے میں مذہب کی بدترین ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ لوگوں نے میرے سوال کے جو جوابات دیے تھے یعنی فرقہ واریت، انتہا پسندی، تعصب، عدم برداشت، دہشت گردی، مذہب کے نام پر استحصال، پیری مریدی کا سلسلہ، یہ سب چیزیں دراصل بے لگام جذباتیت کے شاخسانے ہیں۔ ایسے جذباتی لوگ جب مذہب کی ترجمانی کرتے، اس کو اپناتے، اس کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں تو پھر یہ سارے مسائل وجود میں آجاتے ہیں۔''

یہ بات لوگوں سے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ایک اور صاحب نے اعتراض کیا۔

''انسان تو جذبات کے سہارے جیتا ہے اور مذہب بھی تو جذبات کی طرف بلاتا ہے۔''

''نہیں یہ تصور درست نہیں کہ مذہب جذبات کی طرف بلاتا ہے۔قرآن اول تا آخر پڑھتے چلے جائیں، اس نے اپنی دعوت کو خالص عقلی بنیادوں پر اٹھایا ہے۔ ہاں عمل پر ابھارتے ہوئے وہ کبھی جذباتی اپیل کر دیتا ہے مگر وہ دعوت عقلی دلائل کی بنیاد پر دیتا ہے۔ یہی حقیقت اس نقطہ نظر کی تردید کے لیے کافی ہے۔ باقی رہے انسان تو بے شک وہ جذبات کے سہارے جیتا ہے، لیکن زندگی کے بیشتر فیصلے وہ عقلی بنیادوں پر کرتا ہے۔ یہ ستم وہ صرف مذہب پر ڈھاتا ہے کہ جذباتی انداز سے اس کے حق و باطل کا فیصلہ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔''

آخری بات کہتے ہوئے عارف کے لہجے میں جلال آ گیا تھا۔

''یاد رکھیے مذہب کے حق و باطل کے سنگین ترین مادی نتائج آخرت میں نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ کسی غلط عقیدے کو اس بنا پر برداشت نہیں کریں گے کہ یہ آپ کے جذبات کو سکون دیتا تھا۔ یا آپ کی اس سے جذباتی وابستگی تھی۔آپ لوگوں کو معقولیت کے ساتھ صحیح غلط کا فیصلہ کرنا ہوگا ورنہ اس کے بدترین نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جذبات میں آ کر آپ کسی ٹرین کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو وہ آپ کے لیے نہیں رکے گی۔ کچل کر نکل جائے گی۔ یہی معاملہ قیامت کی ٹرین کا ہے۔ قیامت کی ٹرین بھی آپ کو آپ کے جذباتی انداز فکر سمیت کچل ڈالے گی۔اس لیے مذہبی تصورات میں ہمیشہ عقل سے مدد لیجیے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیے۔''

''مگر ہم جذبات کیسے چھوڑ دیں۔ مذہب اسلام میرا تعصب ہے۔ میری اس سے جذباتی وابستگی ہے۔ میں کسی عقلی دلیل پر اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' ایک صاحب نے جوش میں آ کر کہا۔

''اسلام چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ واحد مذہب ہے جو عقل و فطرت کی بنیاد پر کھڑا ہے۔

مگر کیا آپ کے مخصوص فرقے اور خاص قسم کے نظریات کی بھی یہی حیثیت ہے کہ قرآن ان کی تائید کے لیے نازل ہوا تھا۔قرآن اسلام کی کتاب ہے کسی فرقے کی نہیں۔ہاں مگر ہم اپنے نظریات کو اسلام اور دوسروں کے نظریات کو گمراہی سمجھتے ہیں۔ یہ وہی جذباتی پن ہے جو مذہب کا اصل المیہ ہے اور جس کے نتیجے میں مذہب بدنام ہو جاتا ہے۔

حقیقی مومن وہ ہے جو مذہبی تصورات،نظریات اور عقائد کو جذباتیت کے بجائے عقل سے سمجھے،بصیرت کی آنکھ سے پرکھے اور پھر جو سمجھا اس پر پورے جذبے سے عمل کرے۔ اور اس کے لیے تیار رہے کہ کسی اور نے زیادہ بہتر بات سمجھا دی تو وہ اسے اختیار کرلے گا۔ یہ راستہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ یہ جنت کا راستہ ہے۔''

عارف لمحے بھر کے لیے رکے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

''آپ کا اپنے بیوی بچوں سے جذباتی تعلق ہوسکتا ہے۔آپ ان سے ملنے کے لیے جذباتی ہوسکتے ہیں۔مگر جذبات کے سہارے آپ گھر تک نہیں پہنچ سکتے۔اس کے لیے ہر موڑ پر عقلی فیصلہ کرنا ہوگا۔یہی طریقہ جنت کی منزل تک پہنچنے کا ہے۔اس راہ کا ہر موڑ عقلی فیصلہ کر کے اختیار کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ہر دوسرا طریقہ جہنم میں جاتا ہے۔''

عارف کی مجلس میں آج ایک اور سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا تھا۔

کیا گزرے گی......

اس دنیا میں کسی سے محبت کی دو بنیادی وجوہات ہوتی ہیں۔کبھی کسی کی کوئی خوبی یا ادا ہمیں بھا جاتی ہے۔ رنگ، روپ، چہرہ، لب ولہجہ، انداز گفتگو، علم ،شخصیت غرض کسی بھی پہلو سے کوئی انسان اپنا نقش ہمارے دل میں قائم کرلیتا ہے۔ یا پھر کسی نے ہمارے ساتھ کوئی بھلائی کی ہوتی ہے۔ جس کے بعد اس کی محبت، شفقت، احسان اور عنایت کا ایک نہ مٹنے والا تاثر دل و دماغ پر ثبت ہو جاتا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس دنیا میں جو ہستی اپنی خوبیوں اور اپنے احسانات دونوں اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہے، اور جو سب سے بڑھ کر انسانوں کی محبت کی مستحق ہے، وہ انسانوں کی دنیا میں سرے سے قابل ذکر ہی نہیں۔ وہ اللہ الرحمٰن الرحیم کی ہستی ہے۔

قیامت قائم ہوگی۔ سرکش ومتکبر، ظالم و فاسق سب جہنم رسید ہو جائیں گے۔ باقی لوگ اللہ تعالیٰ کی لطف وعنایت کی بنا پر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔ لوگ نعمتیں پا کر خالق ارض و سماء کی مہربانی کے احساس سے سرشار ہوں گے۔ پھر ایک روز اللہ تعالیٰ ان اہل جنت کو اپنے حضور طلب کریں گے۔ ان سے پوچھیں گے کہ کیا تم میری نعمتیں پا کر خوش ہو۔ بندے عرض کریں گے، کیوں نہیں۔ ہم صبح وشام ان نعمتوں پر آپ کی حمد کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ایک کو یہ بتایا جائے گا کہ پچھلی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اس کی بے خبری میں اس پر کیا کیا مہربانیاں کی تھیں۔ اس کی جان مال عزت وآبرو کو کس طرح بچایا تھا۔ انھیں بغیر کسی حق کے کیا کیا نعمتیں دی تھیں۔ عجب نہیں کہ پھر کہا جائے کہ جو لوگ اُس بے خبری کے باوجود تڑپ کر صبح وشام میری حمد کرتے رہے، وہ میرے قریب آجائیں۔ باقی لوگ دور اپنی جگہ بیٹھیں رہیں گے۔

اُس دن کیا گزرے گی دور بیٹھنے والوں پر۔ اُس روز کیا مقام ہوگا قریب آنے والوں کا۔ بڑا نصیب والا وہ ہے جس نے اس دن کے آنے سے پہلے قریب آنے کا راز سمجھ لیا۔

بادشاہ بھی مرجاتے ہیں

سعوی عرب کے شاہ عبداللہ کا انتقال ہوگیا۔غریب کی موت میں بھی نصیحت ہوتی ہے،مگر بادشاہ کی موت میں سب سے بڑی نصیحت ہوتی ہے۔

ایک انسان اس دنیا میں جو کچھ پاسکتا ہے، شاہ عبداللہ کی زندگی میں وہ سب کچھ آخری درجے میں موجود تھا۔نوے برس کی عمر پائی۔ 55 برس تک اہم حکومتی عہدوں پر فائز رہے۔ آخری بیس برس ولی عہداور پھرشاہ کی حیثیت میں سعودی عرب کے مختار کل رہے۔ان کو دنیا کے طاقت ورترین، دولت مندترین اورسب سے زیادہ اثرورسوخ رکھنے والے حکمرانوں میں سے ایک شمار کیا جاتا تھا۔ذاتی زندگی میں درجن بھرسے زائد شادیاں کیں۔متعدداولادیں ہوئیں۔ آخری اولاد 79 سال کی عمر میں ہوئی جبکہ 86 برس کی عمر تک تمام امورسلطنت خود چلاتے رہے۔اس طاقت، دولت،صحت اوراقتدار کی بنا پر ان کے پاس ہر وہ چیز آخری درجے میں موجود تھی جس کا تصور بھی ایک عام آدمی کے لیےممکن نہ تھا۔مگر 23 جنوری 2015 رات ایک بجے وہ زندگی سمیت ہر چیز چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔

یہ اس دنیا کا المیہ ہے۔یہی اس دنیا کا المیہ ہے۔یہاں موت آجاتی ہے۔انسان کے پاس سب کچھ ہوتب بھی موت آجاتی ہے۔پھرسب کچھ چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔بیویاں، بچے، دولت، اقتدار، محلات، گاڑیاں،لباس اور پروٹوکول سب چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔آدمی شاہ عبداللہ ہوتب بھی جانا پڑتا ہے۔یہی موت کی وہ نصیحت ہے جو ہر شخص کو سمجھنا چاہیے۔

تاہم ہر انسان کے پاس یہاں یہ موقع بھی ہے کہ وہ خالق کائنات بادشاہ ذوالجلال رب العالمین کا بندہ بننے پر راضی ہوجائے۔ایمان اوراخلاق کواپنی زندگی بنالے۔اس کے نتیجے میں اس کی موت المیے کے بجائے سب سے بڑی نعمت بن جائے گی۔موت کے ساتھ ہی اسے جنت کی بادشاہی مل جائے گی جس کے سامنے دنیا کی کسی بادشاہی کی کوئی حقیقت نہیں۔

کمفرٹ زون Comfort Zone

''اللہ تعالیٰ جب کسی سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو وہ اس کے لیے آسان کر دیتے ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟''

عارف کی محفل کا آغاز ہوا ہی تھا کہ ایک صاحب نے اپنا سوال سامنے رکھ دیا۔ عارف نے مسکراتے ہوئے انھیں دیکھا اور کہا:

ہاں یہ بات درست ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو وہ اس کے لیے آسان کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ تو تکوینی معاملہ ہے۔ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اس کی حکمت ہے۔ میں ایک زیادہ بڑی بات کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کا تعلق مجھ سے اور آپ سے اور آخرت میں ہمارے اجر سے ہے......''

عارف لمحے بھر کے لیے رکے اور لوگوں کے چہرے پر پیدا ہونے والا سوالیہ نشان گہرا ہوتا ہوا دیکھتے رہے۔

''وہ یہ کہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ اجر اس کام کا ہے جو آسان نہ ہو بلکہ جو مشکل ہو۔ یاد رکھیے جو کام ہم اپنے کمفرٹ زون میں رہ کر کرتے ہیں اس کا اجر ہمیشہ کم ہوتا ہے، چاہے وہ کتنا بڑا کام ہو۔ مگر جو کام ہم اپنے کمفرٹ زون سے باہر نکل کر کرتے ہیں چاہے وہ کتنا چھوٹا ہو اس کا اجر بہت زیادہ ہوتا ہے۔''

''کمفرٹ زون کو کچھ اور واضح کریں۔'' ایک صاحب نے دریافت کیا۔

''دیکھیے ہمارے مزاج، ذوق، طبیعت، حالات اور پس منظر کے لحاظ سے کئی معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کا کرنا شروع ہی سے ہمارے لیے آسان ہوتا ہے یا زندگی میں کسی وقت ہو جاتا ہے۔ جیسے جو لوگ مال دار ہیں ان کے پاس روپے پیسے کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ دس لاکھ

روپے خرچ کرنا بھی زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔ لیکن ایک غریب کے لیے دس ہزار بھی بہت بڑی بات ہے۔ اسی طرح ایک طالب علم کے پاس فرصت بہت ہوتی ہے۔ لیکن کاروبار اور گھر در کی ذمہ داری میں الجھے شخص کے لیے کسی نیکی کے واسطے وقت نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اس کی ایک اور مثال صحابہ کرام کا ایمان ہے۔ ان کا ایمان لانا کمفرٹ زون سے باہر نکلنے کے مترادف تھا جبکہ آج میرے اور آپ کے لیے ایمان ایک پیدائشی تحفہ اور ہمارا کمفرٹ زون ہے۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے کہ ہر شخص کے لیے اسی طرح کے کچھ کمفرٹ زون بنا دیے جاتے ہیں۔ ان میں نیکی کرنے کے مقابلے میں کمفرٹ زون سے باہر نکل کر کچھ کرنا ہمیشہ زیادہ باعث اجر ہوگا۔ اس لیے اگر اجر بڑھانا ہے تو یہ معمول بنائیے کہ جب بھی موقع ملے اپنے کمفرٹ زون سے نکل کر کچھ نیکی کیا کریں۔ اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔ تنگی میں خرچ کرنا، غصے کو پی جانا، مصروفیت میں نیکی کے لیے وقت نکالنا بہت بڑے اجر کا باعث ہوتا ہے۔ ایسی نیکیوں کی عادت ڈالیں۔

''لیکن کیا کمفرٹ زون کی نیکیوں کا اجر بڑھانے کا بھی کوئی طریقہ ہے۔'' ایک اور صاحب نے سوال کیا تو عارف نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''بالکل ہے۔ کمفرٹ زون کی ہر نیکی کو چھوٹا سمجھیں۔ اللہ اس کا اجر بڑا کر دے گا۔ لیکن یہ آسان نہیں ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اپنی نیکی کو وہ بڑا سمجھتا ہے۔ یہی اس راہ کی مشکل ہے۔ تاہم اگر آپ اس مشکل پر قابو پا لیتے ہیں؛ بڑی نیکی کو چھوٹا، زیادہ انفاق کو کم، بہت محنت کو تھوڑا اور اعلیٰ کوشش کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں تو پھر آپ کے لیے یہاں بھی بہت بڑا اجر ہے۔''

عارف کی بات تمام ہوئی۔ آج لوگوں نے سیکھ لیا کہ آسانی میں زیادہ اجر کیسے کمایا جاتا ہے اور سہولت میں بھی خدا کی رحمت کیسے حاصل کی جاتی ہے۔

چند برس

یہ ابتدائی دور کا مکہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔ مگر کفار مان کر نہیں دیتے اور اپنے کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ وہ نبوت کے معجزات طلب کرتے ہیں۔ عذاب کی دھمکی پر کہتے ہیں کہ سچے ہو تو ابھی عذاب لاؤ۔ ایسے میں سورہ شعراء نازل ہوتی ہے۔ اس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے پہلے کتنی ہی اقوام کو ہلاک کیا جا چکا ہے۔

سورت کے اختتام پر ایک عجیب بات کہی گئی۔ فرمایا گیا کہ اگر ہم ان کفار کو چند برس اور سامان دنیا میں عیش کرنے کی مہلت دے دیں۔ پھر جس عذاب کا وعدہ ہے وہ ان پر آجائے تو یہ سروسامان ان کے کس کام آئے گا۔

ان آیات کے نزول کے چند برس بعد جنگ بدر ہوئی۔ تمام سرداران مکہ اور سرکش کفار جنگ بدر میں جہنم رسید ہو گئے۔ اللہ کے عذاب کا وعدہ پورا ہو گیا۔ جب پکڑ آئی تو ان کی طاقت اور سروسامانی، لاؤ لشکر، مال و دولت، اولاد اور خدام کچھ کام نہ آئے۔ چند برس میں سب ختم۔

یہ ''چند برس'' کی سروسامانی، عیش و عشرت، ڈھیل اور مہلت ہر انسان کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اسے کوئی پکڑنے والا نہیں۔ وہ کسی بھی جان، مال، عزت و آبرو پر حملہ کرے، کچھ نہیں ہوگا۔ وہ الزام و بہتان، جھوٹ، بددیانتی، کرپشن سے دنیا میں عزت، دولت اور طاقت کو حاصل کر لے۔ کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اس کا ہاتھ کوئی نہیں روکے گا۔

مگر نہیں۔ یہ دنیا ''چند برس'' کا ایک دھوکہ ہے اور کچھ نہیں۔ آج کے ہر کرپٹ، ہر ظالم، ہر دولت مند، ہر طاقتور اور ہر مجرم کو مر جانا ہے۔ 2015 میں نہ سہی 2035 میں سہی۔ سو ایسے لوگوں سے پوچھنا چاہیے۔ اُس وقت وہ کیا کریں گے جب چند برس بعد ان کی مہلت عمل سلب ہوگی۔ جب چند برس بعد ان کا احتساب شروع ہوگا۔ ان پر عذاب شروع ہوگا۔

آگ

سن اسی کی دہائی سے مسلمانوں میں عمومی طور پر دین کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے جو یقیناً بڑی اچھی بات ہے۔ تاہم اس رجحان کے باوجود عمومی طور پر وہ مسلمان نظر نہیں آتے جس کی جھلک سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آتی ہے یا پھر جس کا ذکر قرآن مجید کے بیانات میں اللہ کے مطلوب انسان کے طور پر ملتا ہے۔ اس مطلوب انسان کی تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب ''قرآن کا مطلوب انسان'' دیکھی جا سکتی ہے۔

بدقسمتی سے اس کے برعکس جس قسم کے مسلمان نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر فرقہ واریت اور تعصّبات کے اسیر ہوتے ہیں۔ ایسے ''دیندار'' مرد و عورت سے آپ گفتگو کر لیجیے، تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ صحیح دین سے اس کی مراد اس کا خاص فرقہ ہے۔ وہ اپنے فرقے کے علاوہ ہر ایک کو گمراہ سمجھتا ہے۔ اس کا فرقہ اور نظریات عین حق اور باقی سب باطل ہیں۔

یہ دینداری کسی تحقیق اور جستجو پر مبنی نہیں بلکہ سنی سنائی باتوں پر قائم ہوتی ہے۔ ایسا شخص جس گروہ میں پہلی دفعہ بیٹھ گیا، جس عالم سے پہلے متاثر ہو گیا یا جہاں سے اسے اپنے جذبات و خواہشات کے مطابق دین مل گیا، وہ اس کے لیے حق بن جاتا ہے۔ اب جو شامت کا مارا اس کے خاص نظریات اور تعصّبات سے، چاہے کسی دلیل کی بنیاد پر، اختلاف کر دے وہ اس کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اس کے خلاف مہم چلائی جاتی ہے۔ اسے بدنام کیا جاتا ہے۔

ایسا کرنے والے متعصب لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی طرز عمل کفار مکہ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اختیار کیا تھا۔ یہی وہ رویہ ہے جس کی تنقید سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جس پر روز قیامت جہنم کی آگ کی وعید کی گئی ہے اور یہی رویہ ہے جو آج ہمارے معاشرے کو فرقہ واریت اور دہشت گردی کی آگ میں جلا رہا ہے۔

عام انا خاص انا

''اللہ کی راہ میں سب سے مشکل کام کیا ہے؟'' عارف کی نشست ختم ہو رہی تھی۔ بیشتر وقت لوگ سوالات کرتے رہے اور عارف جواب دیتے رہے۔ آخر میں انھوں نے لوگوں سے یہ سوال پوچھ لیا۔ جوابات آئے اور بیشتر لوگوں کی رائے تھی کہ اپنی جان دے دینا اس راہ کا سب سے مشکل اور بڑا کام ہے۔ عارف خاموش رہے اور اس رائے پر لوگوں کا اجماع ہوتے دیکھتے رہے۔ جب سب بول چکے تو عارف نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دینا شروع کیا۔

''بے شک جان دینا بہت بڑی بات ہے۔ اللہ کے لیے جان دینے کے تو کیا ہی کہنے اور اس کا کیا ہی بڑا اجر ہے۔ مگر غور کیجیے کہ انسانی تاریخ میں جو ہزاروں جنگیں ہوئیں ہیں، ان میں کروڑوں لوگوں نے پورے شعور سے اپنے ملک، قوم، بادشاہ اور متعدد دیگر بڑے مقاصد کی خاطر جان دی ہے اور آج بھی دیتے ہیں......''

عارف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ لوگوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی رائے لوگوں سے مختلف ہے۔ وہ اب اس رائے کو جاننے کے منتظر تھے۔ عارف ان کا انتظار ختم کرتے ہوئے بولے:

''انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک اندرونی شخصیت اور دوسرا ظاہری جسم۔ جان دینا ظاہری جسم کی قربانی ہے۔ بے شک یہ بڑی بات ہے، مگر جان دینے پر ابھارنے کے لیے ایک قادر الکلام مقرر کی زوردار تقریر، جذبات میں ہلچل پیدا کر دینے والی فیصلہ کن گھڑی اور محبت و نفرت کے جذبے کی شدت کا کوئی لمحہ کافی ہوتا ہے۔

مگر اپنی اندرونی شخصیت کو قربان کرنا جسے عام الفاظ میں انا کو قربان کرنا کہتے ہیں، اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ انسان کسی بنا پر کسی خاص لمحے میں یہ کر بھی لے تو اگلے لمحے میں انا زندہ ہو جاتی ہے۔ کسی جذبے کی وجہ سے کسی خاص شخص کے سامنے یہ کر بھی کر لے تو دوسرے شخص کے

سامنے انا تن کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے انا کو ختم کر دیا ہے، مگر وہ پوری طرح موجود ہوتی ہے۔''

''تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ انا ختم ہوئی یا نہیں۔''

''بتاتا ہوں، مگر پہلے یہ سمجھ لیں کہ انا دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عام اور دوسری خاص۔ عام انا اپنا اظہار بہت کھل کر کرتی ہے اس لیے اس کو جاننا بڑا آسان ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے تکبر کہتے ہیں۔ یعنی خود کو کسی بھی پہلو سے بڑا سمجھنا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنا۔ کوئی بھی اس کی نشاندہی کر سکتا ہے اور ہم مخلص ہوں تو فوراً اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم خود کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں تو اس عام انا سے نجات پا لیتے ہیں۔ جبکہ خاص انا کو لوگ سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ خود کو حقیر و فقیر کہنے والوں کی انا بھی آسمان تک بلند ہوتی ہے اور ان کو خبر بھی نہیں ہو پاتی''۔

''اس انا کو کیسے پہچانا جائے؟''، ایک اور شخص نے سوال کیا۔

''اس کی پہچان آسان نہیں۔ مگر اس کی کچھ موٹی موٹی نشانیاں بتا دیتا ہوں۔ پہلی یہ کہ آپ کسی اور انسان کی خوبیوں کے اعتراف کی عادت نہ رکھتے ہوں۔ دوسری یہ کہ جب آپ پر تنقید کی جائے تو آپ ناقد کی بات سمجھنے سے پہلے ہی اس کی بات کا جواب سوچنے لگیں۔ اور تیسری یہ کہ جب کوئی شخص آپ کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرے تو آپ کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح اس میں بھی فوراً کوئی خرابی اور خامی تلاش کرنا شروع کر دیں۔ ان میں سے ہر رویہ یہ بتاتا ہے کہ آپ انا کے مریض ہیں، لیکن چونکہ تکبر ایک سماجی برائی سمجھا جاتا ہے اس لیے آپ اسے چھپا کر رکھتے ہیں۔ لیکن جس نے اپنے مرض کو سمجھ لیا وہ یقیناً اس سے نجات پا لے گا۔''

عارف خاموش گئے اور آسمان معرفت کی ایک اور بارش دلوں کی زمینوں کو سیراب کر گئی۔

انا کا علاج

ابھی نشست کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ لوگ مجلس میں آ کر بیٹھ رہے تھے۔ عارف بھی آ چکے تھے۔ غیر رسمی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔ دوران گفتگو ایک صاحب نے سوال کیا: پچھلی دفعہ نشست کے آخر میں خاص انا اور عام انا والی بات ہوئی تھی۔ ان کی حقیقت اور فرق تو اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ مگر ان کا علاج کیا ہے؟ عارف مسکرائے اور بولے: چلیے نشست کا آغاز اسی سے کریں گے۔

کچھ دیر بعد نشست کا باقاعدہ آغاز ہوا تو عارف گویا ہوئے: انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے اپنی نعمتیں، اپنی خوبیاں اور اپنی کامیابیاں تو نظر آتی ہیں، مگر دینے والا نظر نہیں آتا۔ وہ ملے ہوئے کو دیکھتا ہے۔ دینے والے کو بھول جاتا ہے۔ یہ چیز تکبر یا وہ عام انا پیدا کرتی ہے جس کا پچھلی دفعہ میں نے ذکر کیا تھا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انسان ملے ہوئے سے زیادہ دینے والے کی طرف دیکھتا رہے۔ دینے والا اتنا بڑا ہے کہ اس کو دیکھنے سے انسان کو اپنا آپ بہت چھوٹا لگنے لگتا ہے۔ جو اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنے لگے اسے دوسرے کو کمتر سمجھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایسا انسان کبھی تکبر نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے دیا ہے وہ کسی لمحے سب کچھ واپس لے سکتا ہے۔ یہی تکبر کا اصل علاج ہے۔

''اور خاص انا کا کیا علاج ہے؟ انھی صاحب نے دریافت کیا۔

''خاص انا دراصل سچائی کے عدم اعتراف کا نام ہے۔ یہ اصلاً ابلیس کا وصف ہے۔ اس کا علاج فرشتوں کی پیروی ہے۔ انھوں نے اپنے مقام و مرتبے کو نظر انداز کر کے یہ سچائی مان لی تھی کہ اللہ نے آدم کو جو دینا تھا، دے دیا۔ لہٰذا اب انھیں بھی جھک جانا چاہیے۔ سو خاص انا کا علاج اپنے مقام و مرتبے کو نظر انداز کر کے دوسروں کا اعتراف کرنا ہے۔ یہی میرا اور آپ کا کام ہے کہ جس ابن آدم کو خدا نے جو دیا ہے، اس کا اعتراف کر کے دل کو حسد سے خالی کر لیں۔ ورنہ انسان

شیطان بن جاتا ہے اور آخر کار خدا سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔''

عارف بول رہے تھے اور ہر شخص کا سر خدا کی عظمت کے اعتراف میں جھکا ہوا تھا۔ گفتگو میں ایک لمحے کا وقفہ آیا تو اُنھی صاحب نے سوال کیا۔

''خاص انا میں آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ انسان تنقید کو ماننے کے بجائے اس کا جواب دینے لگے اور اپنے بجائے غلطی بتانے والے کی کمزوریاں ڈھونڈنے لگے۔ فرشتوں کی سیرت میں اس مسئلے کا تو کوئی حل نہیں۔''

''ہو بھی نہیں سکتا''، عارف نے برجستہ کہا۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے غلطی نہیں کرتے۔ غلطی شیطان نے کی تھی۔ اس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جب اس کی غلطی پر توجہ دلائی گئی تو اس نے اعتراف کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے بحث شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ جیسی صاحب علم و قدرت ہستی کے سامنے یہ احمقانہ تقریر شروع کر دی کہ میں آگ سے بنا ہوں اور آدم مٹی سے۔ اس لیے میں بہتر ہوں اور بہتر کمتر کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ یہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کا جواب دینے اور تاویل کرنے کا راستہ ہے۔''

''تو گویا جو شیطان نے کیا تھا وہ ہم کو نہیں کرنا چاہیے؟'' ایک اور صاحب نے نتیجہ اخذ کیا۔

''بالکل! آپ نے درست فرمایا۔ مگر دیکھیے شیطان نے اِسی پر بس نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر اپنی غلطی کا الزام یہ کہہ کر اللہ پر لگا دیا کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔ یہ سرکشی کی انتہا تھی۔ یہی جرم آج بھی ہم لوگ کرتے ہیں جب اپنی غلطی پر توجہ دلانے والے کی کمزوریاں نکال کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی تنقید معتبر نہیں۔ مگر یہ سرکشی کا شیطانی راستہ ہے جس کا انجام وہی ہے جو شیطان کا ہوا تھا۔ ابدی ذلت، ابدی محرومی ابدی جہنم۔''

آج کی نشست میں انا کا اصل مجرم بھی سامنے آگیا اور انا کا علاج بھی۔ سوال کرنے والے صاحب بے اختیار بول اٹھے۔ اعظم بعلمك و ما احسنه۔

ایک مظلوم آیت

قرآن مجید میں شریعت کے کم وبیش تمام احکام قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں یعنی سورہ بقرہ سے سورہ مائدہ میں دیے گئے ہیں۔سورہ مائدہ کے اختتام پر ایک آیت ہے جو پوری شریعت اور دین کے بارے میں ایک اصولی ہدایت دیتی ہے۔مگر بدقسمتی سے آج کے دور میں اس آیت کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جس کی وہ مستحق ہے۔سورہ مائدہ کی 105 نمبر اس آیت کا ترجمہ یہ ہے۔

''اے ایمان والو! تم اپنی فکر رکھو، اگر تم ہدایت پر ہو تو کسی دوسرے کی گمراہی تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گی۔تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تم کو بتادے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو''۔

یہ آیت اہل ایمان کو ایک انتہائی مثبت انداز فکر دیتی ہے۔ یہ انسان کی توجہ خارج کی اس دنیا سے ہٹا دیتی ہے جس میں بہت زیادہ کوشش کر کے بہت تھوڑی تبدیلی لانا بھی آسان نہیں۔ اس کے برعکس یہ انسانوں کی فکر وعمل کا رخ اس کے اپنے وجود کی طرف موڑ دیتی ہے۔اپنی اصلاح اور بہتری کا یہ راستہ ایک ایسی دنیا کا راستہ ہے جہاں انسان کی کامیابی یقینی ہے۔ جہاں وہ مکمل انقلاب برپا کرسکتا ہے۔

مگر بدقسمتی سے دور جدید میں مختلف تاویلات کر کے اس آیت کو غیر اہم بنادیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد لوگوں کی ساری توجہ دوسروں کی طرف رہتی ہے۔ دوسرے کیا کررہے ہیں۔ ان کا علم وعمل کیسا ہے۔دنیا میں کیا ہورہا ہے۔دنیا میں کیسے انقلاب لایا جائے۔دوسرے پر دین کیسے ٹھونسا جائے ایسے لوگوں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

انسانی دماغ ظاہر ہے کہ ایک وقت میں دوسمت نہیں چل سکتا۔جس دل میں دوسروں کی اصلاح کا سودا سما جائے ، بہت مشکل ہے کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف کوئی توجہ دے۔ جو نظر ہمیشہ دوسروں کی طرف اٹھی رہے وہ کیسے اپنے عیوب دیکھنے کے قابل ہوسکتی ہے۔جس کے بعد یہ

سانحہ پیش آتا ہے کہ دوسرے تک دین پہنچانے اوران پر دین نافذ کرنے کے علمبرار اپنی ذاتی زندگی میں فکروعمل کی طرح طرح کی آلائشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ایسے لوگ اپنی اصلاح کو کوئی کام نہیں سمجھتے۔ مسئلہ یہ ہے کہ انسانی اصلاح کوئی ایک دن کا کام نہیں۔ یہ ساری زندگی کا کام ہے۔ پھر اصلاح نفس کے اتنے گوشے ہیں کہ یہ ہمہ وقت انسان کی توجہ چاہتے ہیں۔ انسان کا عمل، اس کا ردعمل، اس کی شخصیت، اس کی نفسیات، اس کی عادات غرض ہر چیز ہر وقت احتساب کا مطالبہ کرتی ہے۔ مگر دوسروں کو دیکھتے رہنے والوں کو یہ علم ہی نہیں ہو پاتا کہ کون سی خرابی کس راہ سے ان کے اندر داخل ہوگئی ہے۔ چنانچہ وہ ساری دنیا میں چراغ جلاتے ہیں، مگر ان کے اپنے اندر اندھیرے جگہ بنا لیتے ہیں۔ وہ ساری دنیا کو وعظ کرتے ہیں، مگر ان کے دل کی سماعتوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

یہاں خیال رہے کہ یہ آیت امر بالمعروف ونہی عن المنکر یا تواصو بالحق کے حکم کو منسوخ نہیں کر رہی، بلکہ اس حکم کی حد بندی کر رہی ہے۔ یہ بتا رہی ہے کہ دوسرے کو نیکی کرنے اور برائی سے رکنے کی تلقین، بس تلقین تک محدود رہنی چاہیے۔ کسی نے مان لیا تو بہت اچھی بات ہے۔ نہیں مانا تو ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں کہ کسی کے سر پر سوار ہو جائیں۔ اس کی گمراہی نہ دنیا میں ہمارا کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ آخرت میں۔ ہمیں بس حق کی شمع روشن رکھنی ہے۔ سچ اور حق بتاتے رہنا اور دلسوزی سے نصیحت کرنی ہے۔ دوسروں پر دین ٹھونسنا، جبر کرنا، زبردستی منوانا یہ دین کی روح کے بالکل خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اس ایک آیت کو سمجھ لیا۔ وہ ذاتی ارتقا کے ختم نہ ہونے والے راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کی شخصیت بے مثل شخصیت بننے لگتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہر روز جنت میں اس کا مقام بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی ایک مومن کا ہدف ہونا چاہیے۔

کوئل کی کوک

کوئل کی کوک ان خوبصورت ترین آوازوں میں سے ایک ہے جنھیں انسانی کانوں نے کبھی بھی سنا ہے۔ گرمیوں کی آمد پر سیاہ رنگ کا نر جب کوکنا شروع کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ درختوں کی ہر شاخ ہوا کے دوش پر جھومنا شروع ہوگئی ہے۔ پتوں کی سرسراہٹ اور ہوا کے جھونکوں کے درمیان بلند ہوتی یہ کوک گرمی کی تپش کا احساس بہت کم کر دیتی ہے۔ کوئل اگر آم کے درخت پر کوک رہا ہو تو لگتا ہے کہ آموں کی تمام تر مٹھاس کوئل کی کوک میں سرائیت کر گئی ہے اور آم کا درخت با آواز کوئل اپنی مٹھاس کو ارد گرد کے ماحول میں تقسیم کر رہا ہے۔

کوئل کی کوک کو سننے کا ایک دوسرا زاویہ بھی ہے۔ یہ زاویہ ایک بندہ مومن کا زاویہ ہے۔ ایسا بندہ جو ہر لحظہ خدا کی یاد میں جیتا اور ہر شے میں اسی کی عنایت کا عکس تلاش کرتا ہے۔ ایسے مومن کی درِسماعت پر کوئل کی دلکش کوک جب دستک دیتی ہے تو بے اختیار اسے محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کی حمد اور اس کی شکر گزاری کے لیے جس مٹھاس، جس محبت اور جس احساس کی ضرورت ہے، کوئل کی کوک اسی ضرورت کے جواب میں تخلیق کی گئی ہے۔

پروردگار عالم کے ہر مخلوق پر ان گنت احسانات ہیں۔ مگر سب سے بڑھ کر اس کے احسان حضرت انسان پر ہیں۔ اس لیے کہ انسان کو ہر نعمت ملی ہے اور نعمتوں کو محسوس کرنے والا دل بھی ملا ہے۔ مگر اکثر لوگوں کو ان نعمتوں کا شکر کرنے والا دل نہیں ملا ہوتا۔ مگر جن خوش نصیبوں کو یہ دل مل جائے وہ تا زیست اسی احساس سے تڑپتے رہتے ہیں کہ خدا کے شکر اور حمد کے لیے کوئی لفظ کافی نہیں ہے۔

ایسے میں گرمیوں کی دوپہر میں جب کوئل کوکتی ہے تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ان کی تلاش کا جواب مل گیا۔ ان کی آنکھوں سے شکر گزاری کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ خدا کے فرشتے ان آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹنے کے لیے دوڑتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ محبت اور شکر گزاری میں ڈوبے یہ آنسو نمکین نہیں بلکہ کوئل کی کوک کی طرح میٹھے ہیں۔ وہ مٹھاس جس کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔

جی پی ایس سسٹم

جی پی ایس (Global Positioning System) انفارمیشن ایج کی اہم ترین ایجادات میں سے ایک ہے۔ یہ نظام زمین کے گرد گھومنے والے سیٹلائٹ کے ذریعے سے ہر طرح کے موسم اور حالات میں کسی بھی ایسی چیز یا انسان کی نقل وحرکت کی پوری معلومات فراہم کرتا ہے جس کے پاس وہ آلہ لگا ہو جو اس سسٹم کے سگنل وصول کرسکتا ہو۔ اسے عام طور پر GPS Tracking System کہتے ہیں۔ اس کا ایک عام استعمال یہ ہے کہ گاڑیوں یا موبائل فون میں یہ سسٹم لگ جاتا ہے جس کے بعد یہ سسٹم ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے میں لوگوں کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ یہ سسٹم ہر قدم پر یہ بتاتا ہے کہ اس وقت آپ کہاں ہیں، اردگرد کیا علاقے ہیں اور آگے کس سڑک پر جانا اور کون سے موڑ مڑنا ہے۔ آپ غلط موڑ مڑ جائیں تو یہ سسٹم الارم بجا کر یہ بتاتا ہے کہ آپ غلط جارہے ہیں۔

کم وبیش یہی معاملہ انسان اور اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے اپنی وحی یعنی قرآن مجید کے ذریعے سے بالکل واضح طور پر ہدایت کا ایک نقشہ دیا ہے جو انسان کو بتاتا ہے کہ جنت تک پہنچنے کا درست راستہ کیا ہے۔ پھر اس کے دل میں ضمیر نام کا ایک آلہ لگا دیا ہے۔ یہ آلہ ہر قدم پر یہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی منزل یعنی جنت تک پہنچنے کے لیے درست موڑ لے رہا ہے یا پھر غلط رخ پر آ گیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اپنی گاڑی اور موبائل میں یہ سسٹم پسند کرنے والے بیشتر لوگوں کو اپنے اندر اس سسٹم کی موجودگی کا احساس نہیں یا پھر وہ اسے بند کرکے رکھنا پسند کرتے ہیں۔

یا ایک دوسرا کام جو ہم لوگ کرتے ہیں وہ یہ کہ اپنی مرضی کے مواقع پر اس سسٹم کو آن کر دیتے ہیں اور جہاں دل چاہتا ہے، اس سسٹم کو آف کر دیتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ خواہشات کے مریض

ہوتے ہیں، وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے وقت اس سسٹم کو بند کردیتے ہیں۔ سسٹم لاکھ شور مچائے کہ جو دیکھا جارہا ہے وہ غلط ہے، جو سنا جارہا ہے وہ منع ہے، جس سے مزے لیے جارہے ہیں وہ عمل حرام ہے، مگر انسان اس سسٹم کی ہر پکار سنی ان سنی کردیتا ہے۔

جو لوگ بہت تعصّبات کے مریض ہوتے ہیں وہ اختلاف رائے کے ہر موقع پر اس سسٹم کو دریا برد کردیتے ہیں۔ وہ اندھی مخالفت کرتے ہیں، بحث برائے بحث کرتے ہیں، نکتہ آفرینی اور جدال کے ہتھیار لے کر میدان میں اتر جاتے ہیں۔ الزام، بہتان، دشنام ہر چیز سے کام لیتے ہیں۔ مگر جو سچائی اپنے نقطہ نظر کے خلاف ہو اس کو کبھی قبول نہیں کرتے۔ یہ کبھی کر بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ اس معاملے میں یہ اپنے جی پی ایس سسٹم کو بند کر چکے ہوتے ہیں۔

کم و بیش یہی معاملہ ہر شخص کا ہے۔ کوئی انا کے لیے، کوئی حرام کمانے کے لیے، کوئی حرام سے لطف لینے کے لیے اور کوئی شخص نام اور مرتبے میں دوسروں سے آگے نکلنے کے لیے اپنے سسٹم کو عارضی یا مستقل طور پر بند کردیتے ہیں۔

حالانکہ جو سسٹم ہمیں دیا گیا ہے وہ آخری درجہ کا پرفیکٹ اور مکمل سسٹم ہے۔ بس ایک دفعہ قرآن میں مطلوب صفات کا نقشہ پڑھ لیا جائے اور پھر اپنے ضمیر کی ڈیوائس کو بند نہ کیا جائے تو انسان کا جنت میں جانا یقینی ہے۔ کیونکہ پھر ہدایت کا یہ GPS نظام اسے خود بخود جنت تک پہنچا دے گا۔

شاید انسانوں کے اس رویے کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسان واقعی جنت تک پہنچنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ جنت پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔ وہ خدا پر بھی ایمان نہیں رکھتا۔ اس کا ایمان ایک وراثتی عقیدہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ورثے میں ملنے والے عقیدے کے لیے لوگ لڑ سکتے ہیں، اس کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے۔ یہی اس سسٹم کی ناکامی کی بڑی وجہ ہے۔

رزق ربانی

''میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ آپ نماز پڑھ لیجیے میں انتظار کر لیتا ہوں۔'' امتیاز صاحب مجھے اپنا ایک واقعہ سنا رہے تھے۔ یہ واقعہ کیا تھا، احسان واعتراف کے اعلیٰ انسانی وصف کا ایسا بیان تھا جس کا ہم لوگ روزمرہ زندگی میں اکثر تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ انھیں ایک دن قبل کسی جگہ جانا تھا۔ ان کے ایک دوست جو اسی طرف جا رہے تھے، انھوں نے پیشکش کی کہ وہ اُن کے ساتھ چلیں۔ چنانچہ امتیاز صاحب کے دوست انھیں ان کی منزل پر لے گئے۔ واپسی پر ظہر کا وقت ہو گیا تو امتیاز صاحب نے نماز پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر ان کے دوست نے تاخیر کا برا مانے بغیر وہ جملہ ادا کیا جو شروع میں بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد کا احوال انھی کی زبانی سنیے۔

''میں نماز پڑھنے لگا۔ اسی دوران میں مجھے خیال آیا کہ اس شخص نے میرے ساتھ بڑی مہربانی کی ہے۔ میرا دل اس کے لیے احسان مندی کے جذبات سے بھر گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں ایک ایسے احسان پر شکر گزار ہوں جو نہ کیا جاتا تو مجھے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جس ہستی کے سامنے میں اس وقت کھڑا ہوا ہوں، میری ساری زندگی اس کے عظیم ترین احسانوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ میرا جسم، میری روح، میرا گھر، بیوی بچے، مال واسباب، میرا ہر لمحہ، زندگی کا ہر پہلو، وجود کا ہر گوشہ اس کریم کے احسانات سے زیر بار ہے۔ اس کی ایک نعمت بھی چھن جائے تو میں برباد ہو جاؤں گا اور زندگی رنج والم کی داستان بن جائے گی۔

میں تڑپ کر سجدے میں گر گیا۔ میں نے کہا کہ مالک! مجھ پر تیرے بے شمار احسان ہیں۔ مگر میں شکر گزاری کے بجائے معمولی محرومیوں اور وقتی مسائل کا رونا روتا رہتا ہوں۔

میرے مالک میں نے تیری بہت بڑی عنایات کو بہت تھوڑا سمجھا اور تیری معمولی آزمائش کو بہت بڑا بنا دیا۔ تو نے زندگی میں مجھے ہزاروں نعمتیں دیں، مگر میں ملے ہوئے ہزار کو بھول کر اور بے شمار کو چھوڑ کر ایک دو نہ ملی ہوئی چیزوں پر ناشکری کرتا رہا ہوں۔ میرے اس جرم عظیم کو معاف کر دے۔‘‘

میں نے امتیاز صاحب سے کہا:

’’آپ نے کل نماز کا قیام نہیں کیا بلکہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں قیام کیا تھا۔ آپ نے کل نماز میں سجدہ نہیں کیا تھا، رزق ربانی سے اپنا دامن بھرا تھا۔ آپ کی کل کی نماز، عام نماز نہیں تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات تھی۔ آپ کی شکرگزاری کا سجدہ بظاہر زمین پر ہوا تھا۔ مگر درحقیقت یہ سجدہ خدا کے قدموں میں کیا گیا ہے۔ اس ملاقات پر خوشیاں منائیے۔ اس سجدے پر ناز کیجیے۔ یہ سجدہ نصیب والوں کو ملتا ہے۔ خاص کر آج کل کے اس دور میں جب ہر شخص ساری نعمتیں پا کر صرف ایک دو چیزوں کے نہ ملنے یا کم ملنے پر عمر بھر ناشکرا بنا رہتا ہے۔‘‘

مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

اس دھرتی پر انسان کا وجود حاصلِ تخلیق ہے۔ خالق نے اپنا یہ شاہکار اس لیے تخلیق کیا تھا کہ انسان اپنی بندگی، محبت، وفاداری اور تعصب کا تنہا مرکز صرف اور صرف اپنے خالق کو بنا لے۔ بدقسمتی سے انسان نے اس دنیا میں ہر کام کیا ہے۔ بس یہی کام نہیں کیا۔

انسان نے بتوں کی پرستش کی۔ جانوروں کو پوجا۔ چاند، سورج اور تاروں کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ درختوں اور پتھروں کے سامنے سر جھکایا۔ انسانوں کو رب بنایا۔ بادشاہوں اور پجاریوں کو مقدس جانا۔ علماء اور درویشوں کی عظمت کا اسیر ہوا۔ قوم اور فرقے کو اپنا تعصب بنایا۔ اکابر پرستی کو اپنا شعار بنایا۔ انسان نے یہ سب کچھ کر کے خود اپنی عظمت کو رسوا کیا اور خالق کی نظر میں خود کو ہمیشہ کے لیے گرا دیا۔

مگر انسانوں میں چند ہی سہی، گنتی ہی کے سہی، کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ غیر اللہ سے بے زار، انسان پرستی کے مرض سے آزاد، تعصّبات سے بلند اور تنہا ایک ہی رب کی محبت سے سرشار۔ دوسرے لوگ بتوں کے پجاری، انسانوں کے غلام، اپنے تعصّبات کے قیدی، اپنی خواہشات کے اسیر اور اپنے مفادات کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ غیر اللہ کی ہر قید کے بند توڑ کر خدا کی محبت، اس کی عظمت اور تنہا اس رب سے وفاداری کو زندگی بنائے رہتے ہیں۔ یہ اس خوف میں جیتے ہیں کہ بندگی کے اس مشن میں، خدا کی محبت کے اس کام میں وہ ناکام ہوگئے تو روز قیامت ان کا کیا ہوگا۔ کیونکہ روزِ قیامت کوئی اور کام قبول ہوگا نہ یہ لوگ کوئی اور کام سیکھتے ہیں۔

کروں گا کیا جو محبت میں ہوگیا ناکام

مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

قیامت کا دن ایسے لوگوں کی سربلندی کا نام ہے۔ ایسے لوگوں کی کامیابی کا نام ہے۔

آخری اولاد

انسانوں کو اپنی ساری اولاد ہی پیاری ہوا کرتی ہے۔مگر سب سے چھوٹی اولاد بالعموم سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔اسے پیار بھی زیادہ ملتا ہے اور ذمہ داریاں بھی کم ہی ڈالی جاتی ہیں۔ اچھی اولاد والدین کی اس مہربانی پر شکر گزار ہوتی ہے مگر بری اولاد بگڑ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی کے ماں یا باپ نہیں۔مگر وہ اپنے بندوں سے ماں باپ سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں۔خاص طور پر آخری امت اور بالخصوص امت مسلمہ کے اِس آخری حصے پر ان کی عنایات بہت زیادہ ہیں۔سابقہ امتوں اور صحابہ کرام کو ایمان لانے پر بہت اذیت اور تکالیف اٹھانا پڑیں۔لیکن آج ایمان لانے پر نہ آگ میں پھینکا جاتا ہے۔نہ ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے ہیں۔نہ وطن چھوڑنا پڑتا ہے۔نہ لوگوں کے طعن و تشنیع سننے پڑتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر جو ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہے یعنی دعوت دین، انفارمیشن ایج نے اس کو بھی بے حد سہل بنا دیا ہے۔مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ آج کے مسلمان نعمتیں پا کر اچھی اولاد بننے کے بجائے بگڑ رہے ہیں۔ وہ ایمان و اخلاق کی پست ترین سطح پر ہیں لیکن خود کو فخر سے امت مرحومہ سمجھتے ہیں۔مسلمان اپنی اس عظیم دعوتی ذمہ داری سے بالکل غافل ہیں جو ختم نبوت کے بعد ان پر آ چکی ہے۔مسلمان غیر مسلموں کو دعوت دین دینے کے بجائے ان سے نفرت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔مسلمانوں کا رویہ وہی ہے جو لاڈ پیار سے بگڑ جانے والی آخری اولاد کا ہوتا ہے۔

مگر لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے ان کے سامنے بوڑھے والدین نہیں، عالم کا پروردگار ہے۔وہ بگڑی ہوئی ''اولاد'' کی طبیعت ٹھیک کرنا اچھی طرح جانتا ہے۔اس نے یہودیوں کے بھی بہت لاڈ اٹھائے، مگر وہ بگڑے تو ان کی شکل بگاڑ دی گئی۔مسلمانوں کو فوری طور پر اپنی اصلاح کرنی ہوگی۔ورنہ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ ان کی طبیعت بھی ٹھیک کر دی جائے گی۔

اس کو کچھ میری خبر ہے کہ نہیں

پچھلے دنوں ایک دوست تشریف لائے۔ اپنے مسائل کا تذکرہ کر کے کچھ آب دیدہ ہوگئے۔ میں نے انھیں تسلی دی۔ اللہ کی بارگاہ میں مسلسل دعا کرنے کی تلقین کی۔ پھر انھیں سمجھایا کہ اللہ کی بارگاہ میں اپنا مسئلہ پیش کر کے صبر سے کام لیجیے اور پھر دیکھیے کہ اللہ کیا کرتا ہے۔ اپنی بات سمجھانے کے لیے میں نے ان کی خدمت میں ایک شعر پڑھا۔

میری آہوں میں اثر ہے کہ نہیں دیکھ تو لوں

اس کو کچھ میری خبر ہے کہ نہیں دیکھ تو لوں

اس شعر میں جو درد ہے وہ اسے محسوس کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ دو لوگوں کی دعا رد نہیں کرتے۔ ایک وہ جو اللہ کا مخلص خادم ہو۔ اپنے تعصّبات اور خواہشات سے بلند ہو کر بندگی اور خدمت دین کی راہ پر گامزن ہو۔ جس کی زندگی کا مرکزی خیال صرف اور صرف اللہ کی ذات ہو۔ ایسا شخص جب مسائل میں گھر جاتا ہے۔ شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کی زندگی اس پر مشکل کر دیتے ہیں۔ راہ خدا میں وہ ستایا جا رہا ہو۔ پھر وہ تڑپ کر اللہ کا نام لیتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں تو اس کی آہ سیدھی عرش الٰہی تک جا پہنچتی ہے۔ لمحہ گزرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ فیصلہ سنا دیتے ہیں، گرچہ اس فیصلے کے نفاذ میں کچھ وقت لگتا ہے۔

دوسرا شخص وہ ہے جس نے خدا کے قادر مطلق ہونے اور اس کے مقابلے میں اپنے عاجز مطلق ہونے کو دریافت کر لیا ہو۔ وہ خدا کی عظمت کو جانتا ہو۔ اس کی بڑائی کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہو۔ اور ساتھ میں اپنی بے کسی پر لاچار ہو چکا ہو۔ مشکلات نے اس کا گھر دیکھ لیا ہو۔ ہر بلا آسمان سے اتر کر اس کے گھر کا پتہ پوچھتی ہوئی سیدھی اسی کے ہاں آتی ہو۔ اور آنے کے بعد

جانے کا نام نہ لیتی ہو۔ اسے لوگوں کے ظلم وستم اور انسانوں کی طرف سے محروم کیے جانے کا سامنا کرنا پڑتا ہو۔ایسا شخص جب تڑپ کر خدا کو پکارتا ہے۔ اس کے دل سے جب آہ نکلتی ہو۔ جب بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکلتے ہوں۔ جب وہ اپنا سر خدا کے قدموں میں رکھ کر رو رہا ہو۔ اپنی خطاؤں پر نادم ہو۔اس خوف میں ہو کہ کہیں حالات کی یہ سختی اس کے گناہوں کا نتیجہ نہ ہو۔

اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی بدلنے کے لیے تیار ہو۔ نافرمانی کی ہر پگڈنڈی کو چھوڑ کر صراط مستقیم پر چلنے کا عزم رکھتا ہو۔ اس عزم کے ساتھ اب خدا کی مدد کا طلبگار ہو۔ ایسے شخص کی پکار، اس کی آہ، اس کی فریاد، اس کی تڑپ خداوند دو عالم کی بارگاہ تک فوراً جا پہنچتی ہے......اس کی بات سنی جاتی ہے......اس کی درخواست مانی جاتی ہے۔عرش اٹھانے والوں کو فوراً حکم ملتا ہے۔ وہ اس حکم کو آسمان والوں تک منتقل کرتے ہیں۔ آسمان والے فوراً اس حکم الٰہی کو زمین والوں تک منتقل کرتے ہیں۔ زمین کے فرشتے اس حکم پر بلا تاخیر عمل کرتے ہیں۔

لیکن یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے اس لیے اس حکم کے ساتھ وقت لکھ کر بھیجا جاتا ہے۔ فیصلہ کے ساتھ اس کے نفاذ کی گھڑی بھی متعین کی جاتی ہے۔ یہ وقت اور یہ گھڑی اکثر کچھ تاخیر سے آتی ہے۔ یہ اگر فوراً آجائے تو پھر امتحان ختم ہو جائے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ دعا کا جواب ہمیشہ دیتے ہیں۔ ہمیشہ بندے کی بھلائی کا فیصلہ کرتے ہیں۔مگر وقت موخر کر دیتے ہیں۔ مانگی گئی چیز میں شر ہو تو اس کی جگہ بہتر چیز دیتے ہیں۔ بندے کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا بندے کے حال سے کبھی بے خبر نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں سنتا ہے۔ وہ ہر حال میں بندوں کے ساتھ بھلائی ہی کرتا ہے۔ بندوں کو اسے پکارتے رہنا چاہیے۔ اپنی اصلاح کرتے رہنا چاہیے۔ صبر سے کام لینا چاہیے۔ یہ طے ہے کہ اس کے بعد زندگی میں خیر اور بھلائی آئے گی اور پریشانیاں اور مسائل دور ہو جائیں گے۔

اصول پسند کیسے بنیں

سورج زمین سے تقریباً نو کروڑ میل دور ہے۔ اگر یہ فاصلہ کچھ کم یا زیادہ ہوجائے تو کرہ ارض سے زندگی ختم ہوجائے گی۔ مگر سورج کو اس کے رب نے ایک اصول کا پابند کردیا ہے جس کے خلاف وہ کبھی نہیں کرتا۔ یہی کائنات کی ہر چیز کا معاملہ ہے کہ وہ مقرر کردہ اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ سوائے انسان کے جن کو آزاد پیدا کیا گیا ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے اصولوں کی پابندی کریں۔ جب انسان یہ کرتے ہیں تو معاشرہ چین و امن سے بھر جاتا ہے اور جب نہیں کرتے تو بدامنی اور فساد پیدا ہوتا ہے۔

تاہم اپنی مرضی سے اصول پسند ہونا بہت مشکل کام ہے۔ یہ اپنے مفاد، جذبات اور آسانی کے خلاف عمل کرنے کا نام ہے۔ وقت پر نماز پڑھنا، دشمنی کے باوجود کسی کے بارے میں عدل کی بات کرنا، حرام کمائی کے آسان مواقع چھوڑ کر حلال کی تنگی میں گزارا کرنا کسی کو پسند نہیں ہوسکتا۔ یہی معاملہ ان اصولوں کا ہے جو بظاہر غیر مذہبی ہیں۔ چنانچہ ٹریفک کی سرخ بتی پر رکنا ہو یا قطار بنا کر اپنی باری کا انتظار کرنا، ہم لوگ یہ چیزیں پسند نہیں کرتے۔

یہ درحقیقت معاشرے کی لیڈر شپ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اصولوں کے معاملے میں لوگوں کی تربیت کریں۔ وہ ان کو بتائیں کہ اگر اصول توڑے جائیں گے تو بظاہر کچھ فائدہ، کچھ آسانی اور جذبات کی کچھ تسکین ہوجائے گی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ پورا معاشرہ تباہ و برباد ہوجائے گا۔ جس سے سب کا نقصان ہوگا۔

مثلاً ٹریفک کے حادثات کا بنیادی سبب قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ لوگ یہ طے کرلیں کہ کوئی شخص ٹریفک کے اصولوں اور قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرے گا تو ننانوے فیصد حادثات ختم ہوجائیں گے۔ تاہم لوگ ایسا نہیں کرتے اور ٹریفک ہی نہیں بلکہ ہر اس اصول اور قانون کو

توڑتے ہیں جس سے ذرا بھی وقتی فائدہ حاصل ہو۔

اس حوالے سے کرنے کا کام یہ ہے کہ ایک عام آدمی کے دل میں اصولوں کی محبت پیدا کی جائے۔ اسے بتایا جائے کہ اصول پسند آدمی اللہ کی نظر میں بہترین انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنی اصول پسندی کی بنیاد پر ساری زندگی تہجد پڑھنے والوں اور ساری زندگی روزہ رکھنے والوں سے زیادہ عزت والا ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں اصولوں کی محبت پیدا ہوگی۔ ان کو اصول کی پیروی کر کے مزہ آنے لگے گا۔ جب سب لوگ سگنل توڑ رہے ہوں گے وہ اطمینان کے ساتھ سرخ اشارے پر کھڑے رہیں گے۔ جب سب لوگ اپنے مفادات کے لیے جھوٹ بول رہے ہوں گے تو وہ سچ بولیں گے اور اگر کوئی نقصان ہو بھی جائے تو اس کو بھی انجوائے کریں گے۔ کیونکہ یہ نقصان ان کو جہنم کے نقصان سے بچالے گا۔

اصول پسندی کا اصل راز اصولوں کو انجوائے کرنا ہے۔ ایسے آدمی کا چاہے کوئی نقصان ہوجائے تب بھی وہ دل میں بہت پرسکون ہوتا ہے۔ ایسا آدمی چاہے کوئی فائدہ حاصل کرنے سے محروم ہوجائے تب بھی وہ اصول پسندی کو انجوائے کر کے زیادہ بڑا فائدہ اور زیادہ بڑی خوشی حاصل کرلیتا ہے۔

آیئے آج سے ہم اصول پسند بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصول پسندی کو انجوائے کرتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی نفع رہ جائے یا نقصان ہوجائے، ہم کبھی اصول کے خلاف نہیں جائیں گے۔ اس کا نتیجہ آخرت میں تو بلاشبہ جنت میں اعلیٰ مقام ہے مگر اس دنیا میں بھی ذہنی سکون کی وہ دولت ہے جو لاکھوں روپے کما کر بھی نہیں مل سکتی۔ اس کا دوسرا دنیوی نتیجہ ان بیماریوں سے بچ جانا ہے جو لاحق ہوجائیں تو زندگی کا لطف غارت ہوجاتا ہے۔

بیوہ کی عدت

قرآن مجید میں طلاق یا شوہر کی وفات کے بعد خواتین کو عدت پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدت پوری کرنے کے بعد خواتین دوسری شادی کرسکتی ہیں۔ عدت کی مدت سے قبل وہ دوسری شادی نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ عدت کا اصل مقصد ہی یہ معلوم کرنا ہے کہ خواتین حمل سے تو نہیں۔ وہ فوراً دوسری شادی کرلے تو بچے کے نسب کا مسئلہ ہوجائے گا۔یہی سبب ہے کہ جس خاتون کا نکاح ہوا اور تعلق زن وشو قائم نہ ہوا ہو اس پر کوئی عدت نہیں (الاحزاب 49:33)۔ اس لیے کہ نہ میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوا نہ حمل کا امکان ہے اور نہ عدت کا مطالبہ کیا گیا۔

مطلقہ کی عدت تین حیض ہے اور چونکہ اصل مقصد عورت کے پیٹ کا حال جاننا ہے اس لیے مرد کو یہ حکم ہے کہ وہ ایک ایسے طہر میں طلاق دے جس میں تعلق زن وشو قائم نہ ہوا ہو۔اس کے بعد تین حیض سے یہ بات یقینی ہوجاتی ہے کہ یہ خاتون حمل سے نہیں۔شوہر کی وفات کی صورت میں چونکہ ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی اس لیے بیوہ کی عدت ذرا بڑھا کر چار ماہ دس دن کردی گئی ہے تاکہ تین حیض سے قبل تعلق قائم بھی ہوا ہو تب بھی مزید سوا مہینے سے معاملہ اور واضح ہوجائے۔عورت اگر حاملہ ہے تو اسی وجہ سے مدت عدت وضع حمل تک ہوجاتی ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں ایک بیوہ پر اصل پابندی بس یہی ہے کہ عدت کے عرصے میں دوسری شادی نہیں کرے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کے لحاظ میں کہ بیوی شوہر کے گھر ہی میں عدت گزار رہی ہوتی ہے بیوہ کو تلقین کی ہے کہ وہ سوگ کی کیفیت میں عدت گزارے اور اس عرصے میں کوئی زیب وزینت نہ کرے۔ارشاد نبوی ہے:

''بیوہ عورت رنگین کپڑے نہیں پہنے گی، نہ زرد نہ گیرو (سرخ مٹی) سے رنگے ہوئے۔ وہ زیورات استعمال نہیں کرے گی۔اور نہ مہندی سرمہ لگائے گی۔''(ابوداؤد: رقم 2304)

ایک بیوہ پر قرآن و حدیث میں دین کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں اتنی ہی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے فقہا کے ہاں بیوہ پر ایک اور پابندی اکثر بیان کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس عرصے میں بیوہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ ہم کوشش کے باوجود قرآن وسنت اور حدیث میں اس حکم کا کوئی ماخذ تلاش نہیں کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ پابندی مرحوم شوہر کے نسب کو محفوظ کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے کہ اس عرصے میں بیوہ کہیں ناجائز تعلق قائم کر کے شوہر کے سر کوئی ایسا بچہ نہ ڈال دے جو اس کا نہ ہو۔

ہماری ناقص رائے میں اس سوچ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ جس عفیفہ نے یہ ''کارنامہ'' سرانجام دینا ہوگا وہ شوہر کی زندگی میں بھی یہ کام کر سکتی ہے۔ اس کے لیے اسے شوہر کی موت کا انتظار کرنے اور عدت کے ''سنہری موقع'' کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارا دین اس پہلو سے ہماری جو تربیت کرتا ہے اور اس نے فواحش اور بدکاری کو روکنے کے لیے جو عمومی پابندیاں لگا رکھی ہیں وہ اپنی ذات میں بہت کافی ہیں۔ اگر وہ کافی نہیں ہیں تو کوئی اضافی حکم بدکاری کو نہیں روک سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی پابندیوں کے نتیجے میں ایک عام بیوہ بہت سخت مشکلات میں گھر جاتی ہے۔ دور جدید میں خواتین کا گھر سے باہر نکلنا اب ایک معمول ہے۔ پھر عام طور پر خواتین بڑی عمر میں بیوہ ہوتی ہیں جب وہ شادی کی عمر سے بہت دور نکل چکی ہوتی ہیں اور اس عمر میں اللہ تعالیٰ ان سے اوڑھنی اور دوپٹے کی لازمی پابندی بھی اختیاری بنا دیتے ہیں، (النور 60:24)۔ اس بیوہ خاتون کو ہم شریعت کے نام پر گھر میں بند کر دیتے ہیں۔ آج کل کی تیز رفتار زندگی میں رشتہ داروں کے پاس وقت نہیں ہوتا کہ بیوہ سے ملنے آئیں۔ ایسے میں بیوہ کے کہیں آنے جانے پر پابندی لگانا ایک دکھی عورت کو نظر بندی اور قید تنہائی کی سزا دینے کے مترادف ہے۔

سانس

جب ہم کچھ بھی نہیں کر رہے ہوتے تب بھی ہم ایک اہم ترین کام کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کام ہے سانس لینا۔ ہم آرام کی حالت میں عام طور پر ایک منٹ میں ایک سے ڈیڑھ درجن دفعہ سانس لیتے ہیں۔ سانس لینا اتنا غیر محسوس عمل ہے کہ سوائے اس کے کہ ہم کسی دوڑ میں حصہ لیں ہمیں کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں۔

سانس لینے کا عمل ہماری زندگی کی سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ ہم کھانا کھائے بغیر کئی دن جی سکتے ہیں۔ بغیر پانی کے بھی ایک دو دن گزار سکتے ہیں۔ مگر بغیر سانس کے ایک منٹ بھی جی نہیں سکتے۔

سانس لینے کے عمل میں ہم اپنے جسم سے کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں اور آکسیجن کو جذب کرتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہے جو جسم کے سب سے بڑے اندرونی اعضا یعنی پھیپھڑوں اور ایک انتہائی پیچیدہ اور نازک نظام تنفس کی مدد سے سرانجام پاتا ہے۔ یہ آکسیجن ہمارے خلیوں کو دوبارہ پاک صاف کر کے ہماری زندگی کو قائم و دائم رکھتی ہے اور پیدائش سے موت تک ایک لمحے کے وقفے کے بغیر ہمیشہ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اس عمل میں ہم روزانہ گیارہ ہزار لیٹر آکسیجن فضا سے اپنے جسم میں منتقل کرتے ہیں۔

ایک ایسے دور میں جب ہم مہنگائی کا رونا روتے ہیں، اللہ تعالیٰ اتنی ساری آکسیجن ہمیں روزانہ مفت دیتے ہیں۔ پھر اس کو استعمال کرنے والا پورا نظام بھی بلا معاوضہ ہمیں ملا ہوا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ ورنہ اس جیسی ان گنت نعمتیں ہمیں ساری زندگی مفت ملی رہتی ہیں۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ جب بھی شیطان ناشکری اور محرومی کی نفسیات ہم میں پیدا کرے ہم ان تمام نعمتوں کو یاد رکھیں اور ہر سانس کے ساتھ اپنے رب کا شکر ادا کرتے رہیں۔

بادل

اس دھرتی پر جو کچھ بھی زندگی پائی جاتی ہے وہ پانی کی بدولت پائی جاتی ہے۔اس زمین کا ستر فیصد سے زائد حصہ سمندروں پر مشتمل ہے۔سمندر کے اس پانی کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ان کا پانی سخت کھاری کر دیا ہے تاکہ یہ پانی خراب نہ ہو۔تاہم یہ کھارا پانی انسانوں، زمین کے حیوانات اور نباتات کے لیے قابل استعمال نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ سمندر کا پانی عمل تبخیر کے ذریعے سے بخارات میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر میٹھے پانی کی شکل میں مختلف جگہوں پر برس جاتا ہے۔

سمندر کے اس پانی کو ہزاروں میل دور لے جا کر برسانے کا فریضہ بادل اور ہوا سرانجام دیتے ہیں۔بادل اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہیں۔ان میں اتنا زیادہ پانی ہوتا ہے کہ اگر تمام کے تمام برس جائیں تو خشک زمین ہی ختم ہو جائے۔تاہم بیشتر بادل سمندر پر برس کر ختم ہو جاتے ہیں۔جو زمین تک آتے ہیں وہ مکمل طور پر نہیں برستے بلکہ جزوی طور پر برستے ہیں۔ بہت سے بادل فوری طور پر برسنے کے بجائے برف باری کی شکل میں پانی کو مستقبل کے استعمال کے لیے پہاڑوں پر جمع کر دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بادل اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔یہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ دنیا کسی اتفاقی حادثے کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئی۔ایسا ہوتا تو سارے بادل ایک ساتھ برس کر ختم ہو جاتے اور پیچھے موت چھوڑ جاتے۔لیکن ہم جانتے ہیں کہ بادل ایک خاص مقدار ہی میں برستے ہیں۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا ایک علیم و خبیر رب کی تخلیق ہے جو مسلسل اس کے احوال کی خبر رکھ کر انتظام چلا رہا ہے۔جلد وہ دن آ رہا ہے جب وہ رب ہر شخص سے پوچھے گا کہ تم نے پانی کی عظیم نعمت کا کتنا شکر ادا کیا تھا۔

جوانی کے بعد

کہتے ہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں۔ جوانی زندگی کی بہار ہے۔ بہار اپنے جوبن پر ہو تو واقعی دیوانہ کر دیتی ہے۔ یہ بھلا کیوں نہ دیوانگی کہلائے۔ جوانی حسن ہے۔ جوانی طاقت ہے۔ جوانی لذت ہے۔ جوانی جسم اور جذبے کے عہد شباب کا نام ہے۔

مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر عروج کو زوال ہے۔ جوانی میں ایسا کیا ہے کہ اسے زوال نہ ہو۔ سو شباب کا یہ دریا کتنا ہی چڑھے ایک روز اترتا ضرور ہے۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ حسن کی سرمستی ماند پڑنے لگتی ہے۔ قوت اور مردانگی کی رفعتیں زوال پذیر ہونے لگتی ہیں۔ پہلے تکان کا تصور اجنبی تھا۔ اب تکان کے ساتھ درد بھی جسم سے مستقل رشتہ گانٹھ لیتا ہے۔ نظر کمزور ہونے لگتی ہے۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔ جسم کے ساتھ جذبوں کی چڑھتی لہر بھی کمزوری کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

نادان پھر بھی نہیں سمجھتے کہ بنانے والے نے واپسی کے سفر کا پروانہ جاری کر دیا ہے۔ بڑھتی ہوئی تکان کے باوجود بے تکان دنیا کی سمت دوڑتے رہتے ہیں۔ ابھی بہت زندگی باقی ہے۔ ابھی بہت کام باقی ہے۔ گھر بنانا ہے۔ بچوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ سونڈھال ہوتی طاقت کی ہر رمق سے دنیا خریدنے میں لگے رہتے ہیں۔ جو چھوڑ کر جانا ہے اسے جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

جوانی کی چوٹی سے بڑھاپے کی ڈھلوان کا سفر اسی غفلت میں گزر جاتا ہے اور یقیناً گزر رہا ہے۔ میرا اور آپ کا سفر۔ مگر ہم میں سے کوئی بھی ماننا نہیں چاہتا۔ ہم اس کہانی کو دوسروں کی کہانی سمجھتے ہیں۔ مگر نہیں یہ تو ہماری کہانی ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ یہ کہانی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت سے پہلے خدا کے حضور پیشی کی تیاری فرض ہے۔ رب کی بندگی، مخلوق کی خدمت، صبر اور اخلاق کی زندگی فرض ہے۔ جس نے یہ فرض نبھایا موت اس کے لیے جنت کا دروازہ ہے۔ جس نے اسے فراموش کیا وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔ وہ خدا کو بھول گیا۔ خدا اسے بھول جائے گا۔

فرقہ واریت کا زہر

فرقہ واریت ایک ایسی برائی ہے جس کی مذمت سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین چونکہ اسی مسئلے کا شکار تھے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اس طرزِ عمل کو اختیار کرنے سے روکا۔ مثال کے طور پر سورہ روم میں ارشاد فرمایا کہ ان مشرکوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ بن گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو ہے وہ اسی میں مگن ہے (آیت 32)۔

فرقہ واریت کسی خاص نقطہ نظر سے وابستگی کا نام نہیں، درحقیقت یہ اس انتہا پسندانہ سوچ کا لازمی نتیجہ ہے جس کے تحت ایک انسان خود کو آخری حق پر سمجھتا ہے اور دوسروں کو باطل قرار دیتا ہے۔ ایسا انسان پہلے مرحلے پر یہ فرض کر لیتا ہے کہ جس گروہ میں وہ بیٹھ گیا، جس بات کو اس نے سمجھ لیا، جس نقطہ نظر کا وہ قائل ہو گیا، اس کے غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ غلطی اگر ہو گی تو دوسرے کے ہاں ہی ہو گی۔ باطل اگر کوئی ہے تو دوسرا ہی ہے۔

انتہا پسندانہ سوچ غیر اعلانیہ نوعیت کی پیغمبری کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ یہ حق اس زمین پر صرف اور صرف اللہ کے کسی پیغمبر ہی کو حاصل ہے کہ وہ جو کہہ دے وہ حق بن جائے، وہ جو بیان کر دے وہ خدا کی مرضی قرار پائے، وحی الٰہی کی جو شرح وہ کر دے عین منشائے الٰہی قرار پائے۔ یہ پیغمبر ہی ہو سکتا ہے جس سے اختلاف کا حق کسی کو نہیں مل سکتا، جس کی بات کو قبول نہ کرنے کا مطلب جہنم کی سزا ہے، جس کے فہم کو تسلیم نہ کرنا کفر ہے۔

اس دنیا میں یہ حقوق صرف اور صرف پیغمبروں کے لیے خاص ہوتے ہیں۔ مگر انتہا پسند ذہنیت ان سارے حقوق کو اپنے نام کر لیتی ہے۔ وہ اپنے فہم دین کو آخری سچائی کے طور پر بیان کرتے اور اس سے اختلاف پر پیغمبروں کی طرح وعید سنانے لگتے ہیں۔ مگر درحقیت یہ رویہ غیر اعلانیہ پیغمبری ہے۔ اس دنیا میں اس کا نتیجہ فرقہ واریت اور فساد فی الارض ہے اور روز قیامت خدا کے حضور سخت ترین جواب دہی ہے۔

Eye Candy

Eye candy انگریزی زبان کی ایک اصطلاح ہے۔اس سے مراد کوئی ایسی چیز، منظر یا شخصیت ہے جسے دیکھنا اچھا لگے گرچہ اس کی علمی یا عملی کوئی اہمیت نہ ہو۔میڈیا کی دنیا میں یہ اصطلاح عام طور پر خوبصورت خواتین اوران کی جسمانی نمائش کے لیے استعمال ہوتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ناظرین ان کی نسوانی کشش کی بنا پر اس فلم یا پروگرام کو دیکھیں۔

دنیا بھر کے انٹرٹینمنٹ میڈیا میں آئی کینڈی کا استعمال عام ہے۔خاص کر فلموں اور ٹی وی پروگراموں میں کم ہی اس کے بغیر گزارا ہوتا ہے۔البتہ حالات حاضرہ کے پروگراموں میں اس کا استعمال بہت کم اور علمی پروگراموں میں تو بالکل نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک کے میڈیا کو البتہ یہ اعزاز حاصل ہے کہ حالات حاضرہ کے بیشتر پروگراموں میں کسی آئی کینڈی کو بطور میزبان لے کر ناظرین کی توجہ حاصل کی جاتی ہے۔ٹی وی کے سنجیدہ ناظرین یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت نشر ہونے والے حالات حاضرہ کے بیشتر پروگرام، آئی کینڈی میزبانوں کے ذریعے سے باہمی مسابقت کررہے ہیں۔

میرا تعلق چونکہ برسہا برس تک میڈیا سے رہا ہے اس لیے میں اپنے بعض ایسے تجربات بھی قارئین سے شیئر کرسکتا ہوں جن سے انھیں اندازہ ہوگا کہ سنجیدہ پروگراموں میں بھی کسی حسینہ کی موجودگی محض حسن اتفاق نہیں ہوتی۔ میں کئی برس تک ایک مذہبی ٹی وی پروگرام کا میزبان رہا ہوں جو اس زمانے میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا مذہبی پروگرام تھا۔ پروگرام کی ابتدا میں مینجمنٹ کا اصرار تھا کہ میرے ساتھ کوئی خاتون میزبان بھی ہوں۔ چنانچہ ایک ایسی خاتون کا انتخاب عمل میں آیا جن کا نہ دینی علم سے کوئی تعلق تھا نہ ٹی وی پروگراموں کا کوئی تجربہ تھا۔ان کی واحد وجہ انتخاب نسوانی جمال تھا۔

کچھ پروگرام تو انھوں نے جیسے تیسے کر لیے، مگر پھر ایک پروگرام میں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم تشریف لائے۔ پروگرام کے دوران میں پروڈیوسر صاحب مسلسل ہمارے کان میں یہ صور پھونک رہے تھے کہ فلاں سوال کریں۔ پھر انھوں نے ایک ایسے سوال پر اصرار کیا جو بالکل بے تکا تھا۔ میں نے اس کو نظر انداز کر دیا۔ مگر خاتون کو اس کے بے تکے پن کا اندازہ نہ تھا سو انھوں نے وہ سوال کر ڈالا۔ اب جو لوگ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ بڑے جلالی بزرگ تھے۔ انھوں نے سوال کے جواب میں خاتون کو ڈانٹ دیا۔ اگلے پروگرام سے خاتون ہمیں داغ مفارقت دے گئیں اور پھر کئی برس تک وہ پروگرام میں نے تنہا ہی کیا۔

میں بحیثیت اسکالر بھی کافی عرصے تک ٹی وی کے مختلف پروگراموں میں آتا رہا ہوں۔ پھر ایک وقت آیا کہ میں نے میڈیا کی دنیا کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد جب کبھی کسی ٹی وی چینل کی طرف سے رابطہ کیا جاتا میں معذرت کر لیتا۔ ایسے میں رابطہ کرنے والے اکثر یہ پوچھ لیتے تھے کہ کسی اور اسکالر کے بارے میں بتا دیجیے۔ ایک دفعہ ایسے ہی کسی موقع پر جب میں نے معذرت کی تو پروگرام کے پروڈیوسر نے دریافت کیا کہ سر کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کسی خاتون اسکالر سے رابطہ کرا دیں...... اور ہاں وہ خوبصورت بھی ہونی چاہیے۔ بعد ازاں جب ٹی وی پر بعض مذہبی پروگرام دیکھے جن میں خواتین اسکالر یا نعت خواں موجود تھیں تو اندازہ ہوا کہ انتخاب کرنے والوں نے خوبصورتی ہی کو بنیادی معیار بنایا ہے۔

بہرحال اس طرح کے اور بھی کئی ذاتی مشاہدات ہیں، مگر میں چونکہ طالب علم ہوں اس لیے اپنے مطالعہ کی بنا پر بھی جانتا ہوں کہ میڈیا میں دو چیزیں بکتی ہیں۔ ایک ہاٹ اور ریڈیکل گفتگو اور دوسرے نسوانی جمال اور جنسی کشش۔ دنیا ان کا استعمال انٹرٹینمنٹ میں کرتی ہے۔ مگر ہائے افسوس کہ ہم نے علم و خبر کی دنیا کو بھی آئی کینڈی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

دو تصویریں دو پیغام

یہ دو تصویریں ہیں ۔ پہلی تصویر کراچی کے ایک کم عمر جوڑے کی لاشوں کی ہے جنھوں نے محبت میں ناکامی کے آثار دیکھ کر خودکشی کر لی۔ دوسری تصویر ایک تین سالہ شامی بچے کی ہے جس کی لاش ترکی کے ساحل پر ملی۔ یہ بچہ پناہ کی تلاش میں یورپ پہنچنے کی کوشش میں اپنی ماں اور بڑے بھائی سمیت ڈوب گیا تھا۔

پہلی تصویر دو بچوں کے تنِ مردہ کی نہیں، ہمارے تربیت کے تمام اداروں کے تن مردہ کی تصویر ہے۔ یہ تصویر بتاتی ہے کہ سیاست اور دولت کی چکاچوند کیسے تربیت دینے والوں کو کھا گئی۔ والدین، اساتذہ، علماء، خاندان اور محلے کے بزرگ صدیوں سے انسانی تربیت میں بنیادی کردار ادا کرتے چلے آئے ہیں۔اس تربیت کا ایک اہم عنصر یہ ہوتا تھا کہ آغازِ شباب میں جو غیر معمولی ہارمونل تبدیلیاں آتی ہیں اور ان سے جو جنسی ہیجان جنم لیتا ہے، اس کو کیسے صبر، ضبط نفس، عفت کے احساس اور اپنی روایات کے لحاظ میں قابو میں رکھنا ہے۔ کیسے اپنی خواہشات اور رومانوی جذبات کے بجائے اقدار کے احترام کو ملحوظ رکھنا ہے۔

اس تربیت میں یہ سکھایا جاتا تھا کہ انسانی زندگی سب سے قیمتی چیز ہے۔خودکشی کتنے ہی پاکیزہ جذبے سے کی جائے، ایک بدترین عمل ہے۔محبت ایک فطری چیز ہے، ہو بھی جاتی ہے، مگر اس کا کمال قتل نہیں قربانی ہوتا ہے۔والدین انسان کے سب سے بڑے محسن ہوتے ہیں، جوان کا نہیں ہوسکا، وہ کبھی کسی کا نہیں ہوسکتا۔والدین کو بھی یہ سکھایا جاتا تھا کہ اللہ نے جو حق بچوں کو دیا ہے، ان کو بھی اس سے محروم نہ رکھا جائے۔

مگر اب یہ تربیت کون کرے۔ وہ میڈیا جو نسوانی حسن کو Eye Candy بنا کر اپنی دکان چلاتا ہے۔وہ ٹی وی ڈرامے جہاں نوجوانی کے Lust Affair کو محبت کے نام پر سب سے

بڑی آفاقی قدر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ تعلیمی ادارے جہاں ہارمونز کی اتھل پتھل کا شکار معصوم بچے بچیوں کو علم و اقدار کے بجائے معلومات پڑھائی جاتی اور انگریزی سکھائی جاتی ہے۔ وہ دانشور جنھیں سیاست پر گفتگو کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ مذہبی لیڈر جو فرقہ وارانہ جنگ سے کبھی فارغ نہیں ہوتے۔

دوسری تصویر بھی اپنے پیغام میں بالکل واضح ہے۔ یہ شام کے اس المیے کا بیان ہے جس میں 40 برس سے زائد ایک اقلیتی گروہ ملک کا اقتدار چھوڑنے پر تیار نہیں۔ باپ مر گیا تو قوم پر بیٹے کو مسلط کر گیا۔ لاکھوں لوگوں کے قتل اور ان سے کہیں زیادہ لوگوں کے اجڑنے کے باوجود یہ خانہ جنگی ختم نہیں ہو رہی۔ جنگ سے پریشان لوگ گھروں سے بھاگ رہے ہیں تو دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل رہی۔

ہزاروں برس سے انسانی سماج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ ایک حکمران جب مسلط ہو جائے تو اس سے جان چھڑانے کا طریقہ کیا ہے۔ اقتدار طاقت کا نام ہے۔ کوئی طاقت ور کبھی اپنی مرضی اور خوشی سے اقتدار نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ اقتدار کی تبدیلی کے لیے تاریخ میں اکثر خون بہتا رہا ہے۔ یہ خون غیروں ہی نے نہیں، بارہا اپنوں نے بھی بہایا ہے۔ اقتدار کے لیے باپ نے بیٹے کو، بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو مارا ہے۔

ہزاروں برس کے بعد انسانی دانش نے پرامن انتقال اقتدار کا ایک طریقہ دریافت کیا اور سماج اس پر متفق ہو گیا۔ وہ یہ کہ چار پانچ برس کی حکمرانی کے بعد لازمی ہے کہ حکمران لوگوں سے اپنے اقتدار کی تائید دوبارہ مانگے۔ یہ نہ ملے تو اِسے خاموشی سے اقتدار چھوڑ کر اُسے اقتدار دینا ہو گا جسے لوگوں نے چن لیا۔ جو قومیں اس اصول کو نہیں مانتیں۔ ان کا انجام وہی ہے جو اہل شام کا ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دو تصویریں ہمارے دانشوروں کی اہلیت کا امتحان ہیں۔ پہلی تصویر کا پیغام یہ ہے کہ ہمارے دانشوروں کو سیاست اور دولت کی چکا چوند کو چھوڑ کر تربیت کو اس معاشرے کا اصل مسئلہ بنانا ہے یا نہیں۔ دوسری تصویر کا پیغام یہ ہے کہ ہمیں پرامن انتقال اقتدار کو اس معاشرے میں فروغ دینا ہے یا کچھ مقدس ناموں اور جزوی خرابیوں کی بنیاد پر افراد اور اقلیت کی اُس آمریت کو قبول کرنا ہے جو لاکھوں لوگوں کی جان لیے بغیر معاشرے کی جان نہیں چھوڑتی۔

وقتی چیخ و پکار سے اوپر اٹھ کر ہمیں ان بنیادی معاملات میں ایک واضح نقطہ نظر اختیار کرنا اور معاشرے کو اس رخ پر ڈھالنا ہوگا۔ ورنہ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ پھر حالات بالجبر اپنا ایک فیصلہ ٹھونستے ہیں۔ یہ فیصلہ اکثر صورتوں میں بہت تباہ کن ہوتا ہے۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

ایک دشمن اسلام: خدا کے حضور

پروردگار عالم! میں آپ کا بے حد و حساب شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے جیسے مجرم کو سزا سنانے سے پہلے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دیا۔ پروردگار عالم! آج جب کہ میزان عدل نصب کی جا چکی ہے مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ انصاف ہوگا۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں سچائی کو نہ مانا۔ کسی سچائی کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ میں نے ساری زندگی اسلام کو پڑھا، قرآن کو سمجھا، پیغمبر اسلام کی سیرت کو دیکھا، مگر ہمیشہ ایک معانداور دشمن کی نگاہ سے۔ آپ نے مجھے مذاہب کا عالم بنایا۔ مگر میں نے اس علم کو اسلام دشمنی میں استعمال کیا۔ آپ نے مجھے عقل و فہم اور ذہانت کی دولت سے نوازا مگر میں نے اس دولت کو اسلام دشمنی کے فروغ میں لٹا دیا۔ آپ نے مجھے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت دی، مگر یہ صلاحیت آپ کے بندوں کو آپ کے پیغام، آپ کے دین اور آپ کے پیغمبر سے دور کرنے میں صرف ہوئی۔ مجھے اپنے ہر جرم کا اعتراف ہے۔ مگر سزا کا فیصلہ سنائے جانے سے قبل ایک گزارش آپ کی بلند اور اعلیٰ بارگاہ میں پیش کرنی ہے کہ آپ جیسا عدل کرنے والا پوری کائنات میں کوئی نہیں۔

پروردگار عالم! مجھے معلوم ہے کہ مجھے سچائی کی مخالفت کی بنا پر سزا ہوگی۔ اس بنا پر سزا ہوگی کہ میں نے اسلام کی دعوت کو پانے کے باوجود اس پر کبھی سنجیدگی اور ہمدردی سے غور نہیں کیا۔ بلکہ اپنے خودساختہ تصورات کے مطابق نہ پا کر اسلام کے خلاف بدترین پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ مگر دلوں کے حال جاننے والے رب! میں اس جرم میں تنہا تو نہیں ہوں۔

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اسلام کے جو نام لیوا آپ کے سامنے اِس وقت موجود ہیں، وہ بھی اِسی جرم کے مرتکب ہیں؟ میں نے اگر اپنے پیدائشی مذہب کو آخری حق مانا ہے تو یہ لوگ بھی اپنے پیدائشی فرقے کو آخری حق مانتے ہیں۔ میرے ماحول اور اساتذہ نے جس دین کو میرے سامنے

واحد سچائی کے طور پر پیش کیا میں زندگی بھر اسی کے لیے لڑتا رہا۔ ان لوگوں کے ماحول اور اساتذہ نے بھی جس فرقے اور نظریات کو ان کے سامنے واحد سچائی کے طور پر پیش کیا یہ بھی زندگی بھر اس کے لیے لڑتے رہے۔ میں بھی اڑیل ٹٹو بنا رہا۔ یہ بھی اپنے ''سچ'' پر اڑے رہے۔ میں اپنے تعصّبات کو سچ سمجھتا رہا۔ یہ بھی اپنے تعصّبات کو حق سمجھتے رہے۔

پروردگارِ عالم! میں نے اپنے دین کے علاوہ ہر دوسرے دین کے خلاف عناد پال لیا۔ یہ بھی اپنے فرقے کے علاوہ ہر ایک کے خلاف عناد میں مبتلا رہے۔ میں مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر جیا۔ یہ بھی اسی اصول پر جیے۔ میں نے مخالفت میں ہر اخلاقی حد کو پار کیا۔ انھوں نے بھی پار کیا۔ میں نے حسنِ ظن رکھنے کے بجائے بدگمانی کی۔ یہی انھوں نے کیا۔ میں شہد کی مکھی کی طرح پھولوں کا رخ کرنے کے بجائے گندگی کی مکھی بن کر ہمیشہ کمزور بات کی طرف لپکا۔ یہی ان کا بھی رویہ تھا۔ میں نے بات کو سیاق وسباق سے کاٹا۔ انھوں نے بھی دوسروں کو اسی طریقے پر بدنام کیا۔ میں نے سچائی کے جواب میں نکتہ آفرینی کی۔ انھوں نے بھی سچائی کو ایسے ہی رد کیا۔ میں نے لوگوں کو بہکانے کے لیے الزام، بہتان اور جھوٹ کا سہارا لیا۔ انھوں نے بھی یہی کیا۔ میں نے سچائی کو چھپایا۔ انھوں نے بھی چھپایا۔ میں نے اصل بات سے پہلو تہی کی۔ انھوں نے بھی کی۔ میں حق بات بیان کرنے کے وقت خاموش رہا۔ یہ بھی خاموش رہے۔

اب اگر آپ میرے لیے جہنم کا فیصلہ سناتے ہیں تو سر آنکھوں پر کہ آپ عادل ہیں۔ مگر میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ کس اصول پر جنت میں جائیں گے؟ جب رویہ ایک ہے تو بدلہ بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ ان کا بدلہ اگر جنت ہے تو میں جہنم میں کیسے جا سکتا ہوں؟ اگر میں جہنم کا مستحق ہوں تو میں آپ کے عدل سے یہ کیسے توقع کروں کہ یہ جنت میں بھیجے جائیں گے؟ میرے ساتھ عدل کیجیے۔ یا تو ان کو جہنم میں میرے ساتھ کیجیے یا مجھے ان کے ساتھ جنت میں بھیجیں۔ آپ کی عزت اور جلال کی قسم آپ سے بڑھ کر عدل کرنے والا کوئی نہیں۔

عالی جاہ! مجھے اس کے سوا آپ کی بارگاہ میں اور کچھ نہیں کہنا۔

بیس برس کی بات

میرے ایک محترم اور عزیز دوست پچھلے دنوں ایک مغربی ملک گئے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد میری ان سے بات ہوئی تو ان کو بہت رنجیدہ پایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اپنے ایک ماہ کے قیام کے دوران میں انھوں نے وہاں ہر سمت مادی ترقی کے ساتھ انسان دوستی اور حکومت کی طرف سے سہولیات کی فراہمی کے ساتھ شہریوں کی طرف سے سماجی ذمہ داری کا ایک ایسا امتزاج دیکھا جس نے ان کو ہلا کر رکھ دیا۔ قدم قدم پر وہ وہاں کے معاملات کا پاکستان سے موازنہ کرتے رہے اور کڑھتے رہے۔

یہ غم تنہا ان کا ہی نہیں بلکہ کم و بیش ہر اس حساس اور دردمند پاکستانی کا ہوتا ہے جسے ملک سے باہر کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہوتا ہے۔ اس طرح کے مشاہدات کے بعد لوگوں کے دو ہی نمایاں ردعمل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملک چھوڑنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ملک میں چار سو پھیلی ہوئی خرابیوں کا اتنا اثر لیتے ہیں کہ بہتری کی ہر امید سے مایوس ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا سارا زور بس اسی پر ہوتا ہے کہ اس ملک میں رہتے ہوئے ہی اپنی اور اپنے خاندان کی مادی ترقی کو نصب العین بنالیں اور معاشرتی خیر و شر سے بے نیاز ہوجائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک پاکستان کے حالات کئی پہلوؤں سے بہت زیادہ خراب ہیں۔ جس ملک میں حکمران کلاس کی ایک بڑی تعداد کرپشن کے سمندر میں غوطہ زنی کر کے فارن اکاؤنٹس کو بڑھاتے چلے جانے کے فن کی ماہر ہو۔ جس ملک کی کئی سیاسی جماعتوں میں مسلح ونگز پائے جاتے ہوں جن کا کام اپنے ہی شہریوں کو قتل کرنا اور لوٹ مار کرنا ہو۔ جس ملک کے مذہبی طبقات کا ایک حصہ دہشت گردوں کی حمایت اور تحفظ کو اپنا فرض سمجھتا ہو۔ جس ملک کی اشرافیہ لوٹ مار، ناجائز منافع خوری، ملاوٹ جیسے جرائم کو کاروبار سمجھتی ہو۔ جس ملک کے عوام ٹریفک قوانین توڑنے، ہر جگہ پان اور تھوک کی

پچکاری مارنے کے عادی ہوں وہاں کسی اصلاح کی امید رکھنا بہت بڑے حوصلے کی بات ہے۔

تاہم اس حوالے سے دو باتیں اگر ذہن میں رہیں تو انسان کبھی مایوس نہیں ہوسکتا۔ پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں رہ کر جو شخص ایمان واخلاق کے تقاضوں کو نبھا گیا اور حوصلے کے ساتھ اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی جدوجہد کرتا رہا، اس میں کسی معمولی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ بہت معمولی قربانی دے کر قیامت کے دن انبیا اور شہدا کی قربت کا اعزاز حاصل کرلے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کے عمل سے زیادہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ عمل اس نے کس قسم کے حالات اور پس منظر میں کیا ہے۔ چنانچہ انتہائی مایوس کن حالات میں ڈٹے رہنے والے لوگوں کا اجر وہی ہوگا جو قرآن مجید میں ان لوگوں کا بیان ہوا ہے جو فتح مکہ سے پہلے ایمان لاکر اس کے تقاضوں کو نبھاتے رہے۔

یاد رکھنے کی دوسری بات یہ ہے کہ مغربی ممالک بھی آج جس مقام پر ہیں یہ ایک دن کی بات نہیں۔ چند صدی پہلے قرون وسطیٰ کے عہد میں یورپ بھی انہیں تاریکیوں اور مایوسیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں انھوں نے مسلمانوں کے عروج اور ترقی کو دیکھا تو ان کی آنکھیں ویسے ہی کھل گئیں جیسے آج مغربی ممالک جانے والے مسلمانوں کی کھلتی ہیں۔ جس کے بعد ان کے باشعور طبقات نے اپنے ہاں ایک مسلسل جدوجہد شروع کردی۔ یہ جدوجہد کئی صدیوں تک جاری رہی۔ آخر کار بیسویں صدی میں جا کر وہ وقت آیا جب انھوں نے اپنے ہاں ایک بہترین سماج قائم کرلیا۔ چنانچہ آج اگر ہمارے ہاں بھی ایسے ہی بلند حوصلہ اور صاحب نظر لوگ پیدا ہوجائیں تو یہ صدیوں کی نہیں بمشکل دو عشروں کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے حالات بھی بدل جائیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ لوگ مایوسی کو چھوڑیں اور اپنی ذات سے بلند ہوکر اجتماعی بہبود کے لیے کام شروع کردیں۔

صف دوم

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جن ممالک اور اقوام نے دنیا میں غیر معمولی ترقی کی ہے ان میں غیر معمولی صلاحیتوں کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جو انہیں بام عروج پر لے جاتے ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں کامیابی کی وجہ صف اول میں کھڑے ہوئے اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ صف دوم میں کھڑے ہوئے اوسط صلاحیتوں کے لوگ ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے لوگوں کو کم تعداد میں پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ پیدا ہو بھی جائیں تو یہ کسی ایک فن یا شعبے ہی میں مہارت رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اجتماعی زندگی کسی ایک شعبے کا نام نہیں بلکہ اس میں کامیابی کے لیے ہمہ جہتی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ جدوجہد تنہا ایک شخص نہیں کر سکتا، چاہے وہ کتنی ہی اعلیٰ صلاحیت کا مالک ہو۔ وہ یہ کوشش کرے گا تو اپنے اصل کام کی طرف توجہ نہیں دے سکے گا نہ وہاں اعلیٰ ترین نتیجہ پیدا کر سکے گا۔

چنانچہ یہ دوسری صف کے لوگ ہوتے ہیں جو مددگار کے طور پر اٹھتے ہیں اور بظاہر کم اہمیت کے اور کم نمایاں ہونے والے وہ کام کرتے ہیں، جن کی وجہ سے صف اول کے لوگ اجتماعی سطح پر کوئی بہت نمایاں کام کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ گویا صف دوم کے لوگ گمنامی کی قبر میں دفن ہوتے ہیں، تب کہیں جا کر ایک اعلیٰ انسان کوئی بڑا اجتماعی کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

اس کی ایک سادہ ترین مثال جنگ و جدل کی ہے۔ عام طور پر جنگوں میں فتح کے بعد سپہ سالار کا نام بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ سپہ سالار کی تمام تر اہمیت کے باوجود اگر عام سپاہی اپنا حصہ ادا نہ کریں تو سپہ سالار کوئی کارنامہ کبھی سرانجام نہیں دے سکتا۔ ایک عام سپاہی دشمن کا سامنا کرتا، اپنا خون بہاتا اور بارہا گمنامی کی موت مرتا ہے تب کہیں جا کر جنگ میں فتح حاصل ہوتی ہے۔

اس کی ایک دوسری روزمرہ مثال ٹی وی کے پروگراموں کی ہے۔ عام طور پر ان پروگراموں میں اسکرین پر نظر آنے والے لوگ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کے پیچھے کتنے ہی لوگ خاموشی سے اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کام اچھے طریقے پر کرتے ہیں تب کہیں جا کر ایک کامیاب پروگرام وجود میں آتا ہے۔

تاہم ان تمام مثالوں میں دوسری صف کے لوگ معاوضے پر اپنی خدمات ادا کرتے ہیں۔ ایک نہیں آئے گا تو دوسرا اس کی جگہ لے لے گا۔ اس لیے صف دوم کے لوگوں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن جب کوئی کام رضا کارانہ بنیاد پر کیا جاتا ہے تو ایسی شکل میں صف دوم کے مستقل مزاج اور مخلص لوگوں کو ڈھونڈنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ انہیں کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ وہ کہیں نمایاں بھی نہیں ہوتے۔ انہیں خاموشی سے اپنا کام کرتے رہنا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے معاملات میں صف دوم کے لوگ بہت کم شامل ہوتے ہیں۔ وہ ایک دن شامل ہو بھی جائیں تو اگلے دن رخصت لے لیتے ہیں۔ تاہم اگر کوئی ادارہ یا گروہ معاشرے میں غیر معمولی خدمات سرانجام دینا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ صف دوم کے لوگ ذہنی طور پر یہ جان لیں کہ وہی صف اول کے لوگ ہیں۔ انہی کو اصل میں یہ کام کرنا ہے۔ وہی اس کام کے ذمہ دار ہیں اور روز قیامت وہی اللہ سے اجر کے حقدار ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ صف دوم میں کھڑے ہونا بہت حوصلے کا کام ہے۔ اس میں قربانی دینی پڑتی ہے۔ لیکن ایسے شخص کو نہ معاوضہ ملتا ہے نہ وہ نمایاں ہو پاتا ہے۔ لیکن جب کچھ لوگ یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو پھر معجزات جنم لینے لگتے ہیں۔ پھر معاشرے بدلنے لگتے ہیں۔ ہمارے ملک کو آج صف دوم کے ایسے ہی لوگوں کی تلاش ہے جو استقامت کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اسی پر ہماری اجتماعی ترقی منحصر ہے۔

دعا

قرآن کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر دین کا ایک انتہائی مطلوب مطالبہ ہے۔ یہ ذکر زبان سے کچھ الفاظ دہرا دینے کا نام نہیں بلکہ وہی کیفیت ہے جسے ہم اپنی زبان میں ایسے بیان کرتے ہیں کہ مجھے فلاں شخص یاد آ رہا ہے یا فلاں بات پر فلاں شخص یاد آ گیا۔ گویا یہ دل کی ایک کیفیت ہوتی ہے جو اکثر الفاظ میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی ذکر کی حقیقت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے ایک بہترین رہنما ہے۔ ذکر کے پہلو سے بھی آپ کا عمل ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ جب آپ کی سیرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی اور خدا کی یاد کی جو کیفیت قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے، اس پر جب آپ نے عمل کیا تو اس کا بہترین اظہار آپ کی ان دعاؤں میں ہوا جو کتب احادیث میں بیان کی گئی ہیں۔ سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، صبح وشام اور خوشی وغمی غرض زندگی کے ہر واقعے اور ہر موقع پر آپ نے اللہ کو ان دعاؤں کی شکل میں یاد کیا۔

ان دعاؤں کی دو غیر معمولی خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے بیشتر کے الفاظ وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے۔ یہ الفاظ عرب وعجم کے سب سے زیادہ فصیح اللسان ہستی کے الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ اللہ کی حمد و ذکر کا ایسا خوبصورت بیان ہیں جو کسی اور انسان کے لیے ممکن نہیں۔ ان میں جو تڑپ، محبت، وارفتگی ہے وہ کوئی انسان پا لے تو قرب الٰہی کی منزل با آسانی حاصل کر سکتا ہے۔

ان دعاؤں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اللہ کی صفات کی یاد دہانی کے ساتھ اس سے مکالمے کے ایسے انداز سکھائے گئے ہیں جو انسان دل سے ادا کر دے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ خدا کی نوازشات کا حقدار نہ بنے۔ یہی ان دعاؤں کی اصل قدر و قیمت ہے۔

توبہ قائم رکھنے کا ایک طریقہ

مجھ سے بہت سے لوگ ایک سوال بار بار کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ کوئی خاص گناہ ان سے چھوڑا نہیں جاتا۔ وہ توبہ کرتے ہیں، مگر پھر دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب ہوجاتا ہے۔ یہ دو چار لوگوں کا معاملہ نہیں نیکی کی راہ پر چلنے کی کوشش کرنے والے بہت سے لوگوں کا مسئلہ ہے۔

اس مسئلے کے حل کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اکثر ایسے گناہوں کے ارتکاب کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم ان حالات میں بار بار خود کو ڈال دیتے ہیں جو گناہوں میں مبتلا کردیتے ہیں۔ مثلاً کسی کو اگر غیبت کی عادت ہے اور ساتھ میں بہت بولنے کا مرض بھی لاحق ہے تو غیبت چھوڑنے کے لیے کم بولنے یا سوچ سمجھ کر بولنے کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔

تاہم اس کے باوجود بھی اکثر اوقات بار بار وہی گناہ ہوتا رہتا ہے۔ اس صورتحال سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب کبھی گناہ کا ارتکاب ہو، بغیر کسی تاخیر کے فوراً توبہ کریں۔ ساتھ میں یہ بھی طے کرلیں کہ کسی نہ کسی اضافی نیکی کو بطور کفارہ ضرور کرنا ہے۔ جیسے بعض لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی نامناسب مناظر پر نگاہ ڈال لیتے ہیں۔ اس کے بعد جیسے ہی انسان اس کیفیت سے باہر نکلے پوری شدت کے ساتھ توبہ کرے۔ اللہ سے مدد کا طلبگار ہو۔ ساتھ میں کسی اضافی نیکی کو ضرور کرے۔ جیسے کچھ صدقہ کردے۔ کچھ نوافل پڑھ لے۔ یا خدمت خلق کا کوئی کام کرلے۔

ایسے گناہ عام طور پر شیاطین کی وسوسہ انگیزی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مگر اس طرح کی صورتحال سے وہ بہت پریشان ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ جس مقصد کے لیے وسوسہ انگیزی کی گئی تھی، اس کا بالکل الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایسا انسان خدا سے دور ہونے کے بجائے اس سے اور قریب ہوجاتا ہے۔ جس کے بعد شیاطین تنگ آکر اپنی وسوسہ انگیزی کم کردیتے ہیں اور یوں انسان کو مستقل طور پر اس گناہ سے نجات مل جاتی ہے۔ یہی اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔

مذہبی مشینیں

قرآن مجید میں آیات کی تعداد چھ ہزار سے اوپر ہے۔ان میں وہ آیات جو براہ راست شرعی احکام بیان کرتی ہیں، ان کی تعداد میں اہل علم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ محققین کے نزدیک ان احکامی آیات کی تعداد ڈیڑھ سو سے لے کر پانچ سو تک ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن مجید جو کل انسانیت کی رہنمائی کے لیے نازل کیا گیا اور جس میں اہل ایمان اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت ہے، اس میں احکامی آیات کا تناسب مجموعی طور پر بہت کم ہے۔ جبکہ وہ آیات جن میں اقوام سابقہ کے قصے بیان ہوئے ، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے معاصرین کے درمیان پیش آنے والے حالات کا بیان ہے یا پھر انفس و آفاق کی نشانیوں کی تفصیل کی گئی ہے، یا پھر صفات باری تعالیٰ ، احوال قیامت، اور جنت اور جہنم کا ذکر ہے، ان کی تعداد احکام سے متعلق آیات سے کہیں زیادہ ہے۔

ایسے میں قرآن مجید کے ایک طالب علم کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا سبب ہے کہ قرآن مجید جس کا لفظ لفظ ہدایت ہے، اس میں احکام کا تناسب اس قدر کم ہے۔اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے، مشینی روبوٹوں کی ہدایت کے لیے نازل نہیں ہوا۔ انسان اور مشین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان اصلاً ایک نفسیاتی وجود ہے۔ جبکہ مشین کا کوئی نفسیاتی وجود نہیں ہوتا۔ اس کا پورا نظام کچھ انسٹرکشنز یا ہدایات پر چلتا ہے۔ جبکہ انسان انسٹرکشن پر نہیں چلتے۔ پہلے ان کی نفسیات کسی چیز کو قبول کر کے تبدیلی کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔اس کے بعد ہی وہ کچھ انسٹرکشن یا ہدایات کو قبول کرتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ قرآن مجید میں ہزارہا آیات موجود ہیں جن میں کوئی شرعی حکم بیان نہیں ہوا۔ ان آیات کا اصل مقصد کسی ضابطے قاعدے اور قانون کا بیان نہیں بلکہ انسان کی نفسیات کو متاثر

کرنا ہے۔ان آیات کا مطالعہ انسان کے اندر کو بدلنا شروع کرتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ یہ وسیع و عریض کائنات خود اپنے آپ وجود میں آئی ہے نہ اپنی مرضی سے چل رہی ہے۔ اس کا ایک خالق و مالک ہے۔ اس خالق نے ہر دور میں اپنے انبیا کو دنیا کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے۔ اور آخری دفعہ یہ منصب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔ آپ نے آ کر انسانوں کو اللہ کی مرضی سے آگاہ کیا۔ اب جو شخص آپ کی پیروی کرے گا دنیا اور آخرت کی فلاح اس کا مقدر ہو گی۔ اور جو شخص نافرمانی کی راہ اختیار کرے گا، ہلاکت اور بربادی اس کا مقدر ہو گی۔

بدقسمتی سے قرآن مجید کی یہی وہ حکمت ہے جس سے آج کل کے لوگ بالکل ناواقف ہیں۔ وہ دین کے احکام کو ٹھونس دینے اور نافذ کر دینے جیسی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان مشینوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کو کچھ انسٹرکشنز دے دی جائیں تو وہ بدل جاتے ہیں۔ جبکہ ایسی کوششوں کے نتیجے میں اگر کچھ بدلتا ہے تو انسانوں کا صرف ظاہر بدلتا ہے۔ ان کی نفسیات، ان کا اخلاقی وجود اور ان کا باطن ایسی ہر انسٹرکشن سے غیر متعلق رہتا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

آج ہم پوری دنیا میں اسلام کے نام پر ایک شور اور ہنگامہ دیکھتے ہیں۔ ڈیڑھ ارب سے زیادہ مسلمان دنیا میں موجود ہیں۔ مگر حیرت انگیز طور پر ان حاملین اسلام اور قرآن کے وہ اثرات دنیا میں نظر نہیں آتے جو چند ہزار صحابہ کرام نے پیدا کر دیے تھے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ صحابہ کرام کی نفسیات کو قرآن مجید نے بدل کر رکھ دیا تھا۔ جبکہ آج ہم لوگوں کو مشین سمجھ کر دیندار بناتے ہیں۔ چنانچہ نتیجے کے طور پر اعلیٰ انسان نہیں بلکہ مذہبی مشینیں ہی وجود میں آتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت کی ابدی بادشاہی کسی قسم کی مذہبی یا دینی مشین کے لیے نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل اعلیٰ انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ قرآن مجید یہی انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایسے ہی انسان وہ لوگ ہیں جن کی آج دنیا منتظر ہے۔

نہیں ملتے......

میں تھک گیا ہوں......ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔نہیں ملتے......مگر نہیں ملتے۔آج جب سب سے بڑھ کر ساز و آہنگ کا چلن عام ہے، لحن داؤدوالے بہت ملتے ہیں، مگر نغمہ داؤدوالے نہیں ملتے۔

انسانوں کی بڑائی، عظمت اور ان کی محبت سے سرشار لوگ بہت ملتے ہیں۔عشق کی آگ اور جذبوں کی حرارت کو نغموں کی صورت دینے والے بہت ملتے ہیں۔دلربا نازنینوں کی رعنائی کو ساز و آواز کا نذرانہ عقیدت پیش کرنے والے بہت ملتے ہیں۔حسن و شباب کے جلووں اور عشق و محبت کی داستانوں کو لحن و الفاظ کے قالب میں ڈھال کر لافانی گیت تخلیق کرنے والے بہت ملتے ہیں۔

مگر نہیں ملتے۔بے مثل انسانوں کے باکمال خالق کی حمد کرنے والے نہیں ملتے۔محبت کی تپش، حسن کی ادا، شباب کا خمار، ساز کا آہنگ جس نے بنایا، اس کی حمد کرنے والے نہیں ملتے۔ مخلوق کے ہر وصف کے عاشق مل جاتے ہیں۔آہ مگر خالق کے لامحدود جمال و کمال کے عارف ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔جو عارف نہیں جو واقف نہیں وہ کیا حمد کریں گے۔جو جانتے نہیں بیان کیا کریں گے۔جنھوں نے اسے پایا نہیں وہ دوسروں کو خدا تک کیا پہنچائیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ اس الغنی کو اپنی تعریف سننے میں کوئی دلچسپی نہیں، مگر میں سوچتا ہوں کہ جمال و کمال کا اس درجہ شعور رکھنے والا، حسن و ادا کا ایسا ذوق رکھنے والا انسان، اس صاحب جمال سے اس درجہ کیسے بے نیاز ہوسکتا ہے۔مانا کہ ذات احد کو دیکھا نہیں جاسکتا، مگر اے نادانو! مخلوق کی جن اداؤں پر تم مرمٹے ہو، اسی کے آئینے میں صاحب تخلیق کا جمال و کمال دیکھ لو۔حسن کو دیکھ لیا، گیت کو سن لیا، رنگ و مہک کو پالیا......اسے بھی تو جان لو جو ان کا خالق ہے۔

آج جب سب سے بڑھ کر ساز و آہنگ کا چلن عام ہے، لحن داؤدوالے بہت ملتے ہیں، مگر نغمہ داؤدوالے نہیں ملتے۔میں تھک گیا ہوں۔ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔مگر نہیں ملتے۔

خواب اور شخصیت

انسان اتنا ہی بڑا ہوتا ہے جتنے بڑے اس کے خواب ہوتے ہیں۔لیکن یہ خواب خواب ہی رہ جاتے ہیں، اگرانسان اپنی شخصیت کو اپنے خوابوں سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔

اس دھرتی پر انسانیت کا وجود ایک درخت کی طرح ہے۔درخت کا حاصل پھل ہوتا ہے یا پھول۔باقی اجزائے درخت ہوتے ہیں جو ضروری ہوتے ہیں لیکن حاصل شجر نہیں ہوتے۔ خواب دیکھنے والے لوگ اور اپنی شخصیت کو اپنے خوابوں سے ہم آہنگ کرنے والے لوگ اس درخت کے پھل اور پھول ہیں۔یہی لوگ انسانیت کے قافلے کو آگے بڑھاتے ہیں۔یہ نہ ہوں تو یہ گلشن ہمیشہ کے لیے ویران ہوجائے۔

خواب دیکھنے والے لوگوں کو اپنے خوابوں کی ایک قیمت دینی پڑتی ہے۔یہ قیمت سب سے بڑھ کر اپنی ذات کی سطح پر دینی پڑتی ہے۔ یہ اپنی شخصیت کی تعمیر نو کرنے، اپنے جذبات و احساسات کی تربیت کرنے، اپنی عادات اور رویوں کی اصلاح کرنے اور اپنے انداز فکر کی تطہیر کر کے ادا کرنی پڑتی ہے۔ جو لوگ یہ قیمت دے سکیں وہی قافلہ انسانیت کے امام بنتے ہیں۔ باقی لوگ تو بس اپنی نسل بڑھا کر اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔

خدا کی دنیا اصلاً خواب دیکھنے کی نہیں کام کرنے کی جگہ ہے،لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اعلیٰ اور تخلیقی کام وہی لوگ کرتے ہیں جو خواب دیکھ سکتے ہیں۔خواب اینٹ ہوتے ہیں۔جب ان کو شخصیت اور کردار کی آنچ پر پکایا جاتا ہے تو یہ پکی اینٹ بن جاتے ہیں۔معاشروں کی تعمیر پکی اینٹیں ہی کیا کرتی ہیں۔

آیئے خواب دیکھتے ہیں۔آیئے اپنی شخصیت کو کردار کی آنچ پر پکا کر وہ پکی اینٹیں بنائیں جن سے معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے۔

تکلیف اور نتیجہ

سوال کرنے والے کا سوال ختم ہوا، مگر اہل مجلس کو سوگوار چھوڑ گیا۔ سائل کی داستان دردناک بھی تھی اور اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اس کے درد کو ہر سننے والے کے دل میں اتار دیا تھا۔ یہ شخص عارف کی مجلس میں پہلی بار آیا تھا۔ اس کا سوال اپنی زندگی کے ان دکھوں اور محرومیوں سے عبارت تھا جس نے اس کی زندگی کو تلخیوں سے بھر دیا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ قریبی رشتہ داروں کی طرف سے کی جانے والی بدسلوکی نے معاملات کو اور تکلیف دہ کر دیا تھا۔

عارف حسب عادت سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ کچھ دیر خاموشی میں گزر گئی تو ایک پرانے رفیق نے ان صاحب کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

آپ صبر سے کام لیجیے۔ ان شاء اللہ ساری مشکلیں ختم ہو جائیں گی۔

کب ختم ہوں گی یہ مشکلات؟ سائل نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

یہاں تو ایک مشکل آتی ہے اور ابھی جاتی بھی نہیں ہے کہ دوسری آ جاتی ہے۔ لگتا ہے کہ مشکلات ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ایک کر کے نکلتی چلی آتی ہیں۔

اب یہ رفیق خاموش ہو گئے اور جواب دینے کے بجائے عارف کو دیکھنے لگے۔ باقی اہل مجلس کی نگاہیں بھی عارف کی طرف اٹھ گئیں۔ کچھ ہی دیر میں ان کی آواز بلند ہوئی۔

مشکلات کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ کم یا زیادہ، چھوٹی یا بڑی، پے در پے یا آہستہ آہستہ، یہ مشکلات ہماری زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ خدا کی اس اسکیم کا حصہ ہیں جن کے تحت یہ دنیا بنی ہے۔ اس لیے ان کو تو ختم نہیں ہونا۔

مگر میرا قصور کیا ہے؟ مجھ پر اتنی زیادہ مشکلات کیوں ہیں؟

آپ کا کوئی قصور نہیں۔ مشکلات کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ اللہ کو زیادہ محبوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی ذات سے زیادہ قریب رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے مشکلات کے اس امتحان کو مسلسل

جاری رکھے ہوئے ہیں۔البتہ ایک غلطی ہے جو آپ کر رہے ہیں۔اس کی اصلاح کر لیجیے۔

عارف کی بات سے سائل کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نمودار ہوئی تھی۔اس نے فوراً کہا۔ مجھے بتائیے کہ میں کیا غلطی کر رہا ہوں۔

دیکھیے ! انسان کا واسطہ کسی محرومی سے پڑے یا لوگوں کی طرف سے کسی قسم کے تکلیف دہ رویہ کا سامنا ہو،ان سے جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ ہمارے دماغ میں ہوتی ہے، ہماری نفسیات میں ہوتی ہے۔اگر ہم اپنے دماغ اور نفسیات کو کنٹرول کرنا سیکھ لیں تو خارج کی کوئی مشکل دور ہو یا نہ ہو کم از کم اس اذیت سے ہم خود کو بچا سکتے ہیں جو خود ہم اپنے آپ کو دے رہے ہوتے ہیں۔

سائل کی آنکھوں سے ابھی بھی سوال جھلک رہا تھا۔عارف بولتے رہے۔

کسی نوجوان لڑکی کو جس کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہو،کوئی تکلیف دہ مرض ہو جائے تو وہ کیسی اذیت میں آجائے گی۔اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔مگر ہم سب جانتے ہیں کہ شادی کے بعد بچیاں حاملہ ہوتی ہیں۔ وہ نو مہینے تک حمل کی تمام سختیاں اور ولادت کا اذیت ناک مرحلہ جھیلتی ہیں۔مگر کیا وہ نفسیاتی طور پر پژمردہ اور پریشان ہوتی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ کسی بچی کو شادی کے کچھ عرصے بعد تک حمل نہ ٹھہرے تو وہ پریشان ہو جاتی ہے اور ہزار علاج کر کے اس مرحلے تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔آخر کیوں؟

ظاہر ہے کہ بچوں کی خوشی کو حاصل کرنے کے لیے؟ سائل نے فوراً جواب دیا۔

ہاں اس کی نظر نتیجے پر ہوتی ہے۔تو پھر آپ بھی نظر نتیجے پر رکھیں۔ یہ مشکلات اور مسائل وہ حمل ہے جس سے جنت کی اعلیٰ ترین نعمتوں کا نتیجہ نکلے گا۔ جب آپ اس رخ سے معاملے کو دیکھنے لگیں گے تو پھر آپ کو بھی یہ تکلیفیں بری نہیں لگیں گی۔آپ کا زاویہ نظر بدلے گا اور پھر ہر تکلیف آپ کے ذہن کو اذیت دینے کے بجائے خوشی دینے کا سبب بن جائے گی۔

عارف کی بات ختم ہوئی اور سائل کے چہرے پر اطمینان کی لہر چھائی۔

نظام اور افراد

ایک زمانے میں پاکستان میں ٹیلیفون لگوانا اور خراب ہونے کی صورت میں اسے ٹھیک کرنا بڑا مشکل مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ تاہم پھر پی ٹی سی ایل کو پرائیویٹائز کیا گیا۔ اس نجکاری کے بعد نئے مالکان کے لیے منافع کے حصول کا ذریعہ یہی تھا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ فون استعمال کریں۔ چنانچہ اس کے بعد نیا فون لگوانا اور خرابی کی شکل میں اسے ٹھیک کرانا بہت آسان کر دیا گیا۔ آپ آج فون کریں فوراً آپ کے ہاں فون لگ جائے گا۔ فون اگر خراب ہے تو شکایت ایک مرکزی جگہ رجسٹر ہوتی ہے۔ پھر مقامی ایکسچینج کو یہ شکایت بھیجی جاتی ہے ۔ دوسری طرف جب تک صارف یہ تصدیق نہیں کر دیتا کہ شکایت ٹھیک ہوگئی ہے، مرکزی جگہ سے اس سے روزانہ رابطہ کر کے صورتحال معلوم کی جاتی ہے۔

اس کے بعد مقامی سطح پر کام کرنے والے چاہیں بھی تو سستی کر کے معاملے کو طول نہیں دے سکتے۔ تاہم اس کے باوجود بعض دفعہ کئی دنوں بعد ہی شکایت ٹھیک ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بعض مقامات پر لائن مین علاقے کے لوگوں کو اپنا نمبر خود دے دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی خرابی کی شکل میں لوگ لائن مین سے رابطہ کرتے ہیں۔ وہ اسی علاقے میں موجود ہوتا ہے اس لیے اکثر ایک دو گھنٹہ میں فوراً آجاتے ہیں اور مسئلہ ہاتھ کے ہاتھ ٹھیک کر دیتے ہیں۔ مسئلہ حل کرنے کی پہلی قسم ایک اچھے نظام کا نتیجہ ہے۔ لیکن مسئلہ حل کرنے کا دوسرا طریقہ نظام کے بجائے مستعد اور اپنے کام سے مخلص لوگوں کے ذریعے سے مسئلہ حل کرانے کا عمل ہے۔ یہ طریقہ ہر اعتبار سے ایک بہتر طریقہ ہے۔

دنیا میں مسائل حل کرنے کے لیے یہی دو اچھے ماڈل ہیں۔ ایک ماڈل اچھے نظام سے مسائل حل کرتا ہے۔ دوسرا ماڈل افراد کے اندر احساس ذمہ داری پیدا کر کے مسائل حل کرتا ہے۔

لیکن دوسرا نظام مسائل کو بہتر انداز سے حل کرتا ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں بہت سی اصولی ہدایات اور رہنمائی دیتا ہے جنھیں شریعت کے قوانین کہا جاتا ہے۔لیکن وہ زندگی میں بہتری لانے کے لیے اسی دوسرے ماڈل کو استعمال کرتا ہے۔یعنی افراد کے اندر احساس ذمہ داری پیدا کرکے اوران کی بہتر تربیت کرکے انھیں ایسا بنادیا جائے کہ وہ کہے بغیر اپنی ذمہ داری کو پورا کریں اور کسی دنیوی صلے اور داد کی توقع کیے بغیر صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے لیے مخلوق کی خیر خواہی کرنے والے بن جائیں۔

یہ دوسرا ماڈل قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات سے پیدا ہوتا ہے۔اس تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ بندہ خود کو خدا نہ سمجھے بلکہ بندگی کی نفسیات میں جیے۔ وہ مخلوق کے لیے سراپا بھلائی ہو۔ وہ اپنی ذمہ داری سے بڑھ کر کام کرنے کا عادی ہو۔ وہ دوسرے کے حقوق پورے پورے ادا کرنے پر یقین رکھتا ہو اور جہاں ممکن ہو وہ ان کو ان کے حق سے زیادہ دینے کا عادی ہو۔ وہ ضعیف والدین کی اس وقت خدمت کرتا ہے جب ان سے کچھ ملنے کی امید نہیں ہوتی۔ وہ ان مسافروں سے بھلائی کرتا ہے جو اس کو بدلہ نہیں دے سکتے۔ وہ مسکین اور یتیم جیسے کمزور طبقات پر خرچ کرتا ہے جو بدلے میں دعا کے سوا اس کو کچھ نہیں دے سکتے۔

ایسا شخص معاشرے کی طرف سے عائد کردہ ہر ذمہ داری کو ایک مقدس عہد اور امانت سمجھ کر پورا کرتا ہے۔ وہ سماجی اصولوں اور ملکی قوانین کی حتی الامکان پابندی کرتا ہے۔ وہ ظلم اور زیادتی کی ہر قسم سے خود کو دور رکھتا ہے۔ وہ ضبط نفس سے کام لیتا اور روایات کی پاسداری کرتا ہے۔

یہی وہ ماڈل ہے جس کے مطلوبہ لوگ کسی بھی معاشرے کو جنت کا نمونہ بنادیتے ہیں۔ جبکہ ایسے لوگوں کے بغیر دنیا کا ہر نظام آخر کار ناکام ہو جاتا ہے۔

خدا کا لہجہ

اردو کے ممتاز شاعر افتخار عارف کا ایک خوبصورت شعر ہے:

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

یہ شعر بڑی خوبصورتی سے مخلوق کے تکبر کی بے وقعتی کو بیان کرتا ہے۔ ہر بڑائی پسند شخص کا انجام یہی ہوتا ہے کہ وقت اس کی رعونت پر خاک ڈال کر اسے اور اس کی بڑائی دونوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے۔ تاہم یہ شعر خدا کے لہجے کی مکمل ترجمانی نہیں کرتا۔ خداوند دو عالم بلا شک و شبہ ہر بڑائی اور کبریائی کا مستحق ہے۔ ہر حمد، ہر تعریف اور ہر شکر اسی کے لیے ہے۔ ہر چیز کا وہی خالق، وہی مالک ہے۔ وہ بڑا ہے اور بلا شبہ ایک حاکم و مالک کے لہجے میں بھی گفتگو کرتا ہے۔

تاہم قرآن مجید کو بغور پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لہجے کی درست ترجمانی یہ ہے کہ وہ مکمل اعتماد اور یقین کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ یہ انداز گفتگو کسی ایسی ہستی کے لیے ہی ممکن ہے جو ظاہر و باطن سب کا جاننے والا ہو۔ جو ماضی، حال مستقبل سے یکساں طور پر باخبر ہو۔ جسے معلوم ہو کہ اس کی کہی ہوئی ہر بات پتھر پر لکھی ہوئی تحریر سے زیادہ محکم ہے۔ جسے یقین ہو کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ آخری سچ ہے۔ جو خبر وہ دے رہا ہے وہ ہر حال میں پوری ہوگی۔

اس کی سب سے بڑی مثال کفار کا اپنے زمانے کے رسولوں سے مکالمہ ہے۔ ہر زمانے کے کفار کو رسول ان کے کفر کی پاداش میں دنیا کے عذاب سے خبردار کرتے رہے ہیں اور وہ ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ بالآخر عذاب آیا اور کفار کی جڑ کاٹ دی گئی۔ ٹھیک اسی پر اعتماد لہجے میں قرآن انسانیت کو قیامت کے عذاب سے خبردار کرتا ہے، مگر کوئی مان کر نہیں دیتا۔ مگر خدا کا لہجہ یہ بتاتا ہے کہ جلد ہی یہ واقعہ بھی رونما ہو کر رہے گا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ خدا کے اس پر اعتماد لہجے اور اس کلام کو دنیا تک پہنچائیں تاکہ اللہ کے بندے اس کی گرفت سے بچ سکیں۔

درد کا پیغام

ہم میں سے کوئی شخص نہیں جسے زندگی میں کبھی درد نے تنگ نہ کیا ہو۔ درد ہوتا ہے تو انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ زندگی کا لطف غارت ہو جاتا ہے۔ درد سے چھٹکارا پانے کے لیے انسان ہر طرح کے جتن کرتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ مختلف ادویات لیتا ہے۔ جسم کے اس حصے پر مساج اور مالش کرائی جاتی ہے کہ درد سے جان چھوٹ جائے۔

تاہم بہت کم لوگ یہ حقیقت جانتے ہیں کہ درد اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے۔ یہ درد ہمیں اذیت دینے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ ہماری حفاظت اور زندگی کو یقینی بنانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ درد ہی ہے جس کی وجہ سے ہم کوئی فیصلہ کن ضرر پہنچنے سے پہلے نقصان دہ چیز کو خود سے دور کرتے ہیں۔ ہم درد نہ محسوس کریں تو اطمینان سے بیٹھے رہیں گے اور یہ نقصان دہ چیز یا حالات خاموشی سے ہمیں مار ڈالیں گے۔

یہی معاملہ اس دنیا کی ہر اس چیز کا ہے جو بظاہر منفی نوعیت کی ہوتی ہے۔ جس سے بظاہر ہمیں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ جو ہمیں اپنی زندگی میں بری لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اس دنیا میں کوئی منفی چیز بھی بلا وجہ اور بے فائدہ ہرگز نہیں ہے۔ ہاں بعض چیزوں کا فائدہ ہمیں اس دنیا میں نظر آ جاتا ہے۔ جیسے درد کا فائدہ دنیوی جسم کو پہنچنے والے ضرر کے حوالے سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ مگر اکثر منفی اور تکلیف دہ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا حقیقی ضرر اِس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں سامنے آنے والا ہوتا ہے۔ اسے اس دنیا میں براہ راست نہیں سمجھا جا سکتا۔

تاہم درد کی مثال سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ زندگی کی ہر منفی چیز دنیا یا آخرت کے کسی بڑے خیر کو دینے یا بڑے ضرر سے بچانے کے لیے ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مومن ہمیشہ منفی اور تکلیف دہ حالات میں بھی مثبت رہتا ہے۔ وہ منفی چیزوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے، مگر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ یہی درد کا پیغام ہے۔

جنت اور جہنم کا قیام

قران مجید کی سورہ فرقان میں جہنم کے متعلق آیت 66 میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ وہ بدترین مستقر اور مقام ہے۔ یہی بات آیت 76 میں جنت کے متعلق کہی گئی ہے کہ وہ بہترین مستقر اور مقام ہے۔ بظاہر دونوں الفاظ ہم معنی ہیں لیکن صاحب تدبر قرآن امین احسن اصلاحی نے ان دونوں الفاظ کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ یہ دونوں الفاظ جب ایک ساتھ آتے ہیں تو مستقر سے مراد مستقل اور مقام سے مراد عارضی قیام گاہ کے ہوتے ہیں (تدبر قرآن 487/5)۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم تو ہیں ہی مستقل قیام کی جگہیں، وہاں کے عارضی قیام سے کیا مراد ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ جنت اور جہنم بے شک ابدی قیام کی جگہیں ہیں، لیکن دونوں کے اندر بہت مختلف جگہیں ہوں گی جن میں انسان عارضی طور پر رہا کریں گے۔ چنانچہ اہل جہنم کبھی آگ میں ہوں گے، کبھی ان کو خاردار جھاڑیاں چرنے کے لیے لے جایا جائے گا۔ کبھی کھولتے ہوئے پانی کے چشمے سے سیراب کرنے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔

اسی طرح اہل جنت کبھی اپنے گھروں میں ہوں گے، کبھی سیر گاہوں میں، کبھی بستروں پر اور کبھی دوست احباب کی محفلوں میں۔ ان میں سے ہر جگہ ان کا قیام عارضی ہوگا۔ قرآن مجید یہ بتا رہا ہے کہ جنت میں مستقل رہنے کا احساس بھی شاندار ہوگا اور ہر مقام پر عارضی قیام کے دوران بھی وہ بہترین نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ یہی معاملہ جہنم کا ہے کہ اس کا مستقل قیام ہر لمحہ ایک اذیت لے کر آ رہا ہوگا اور اس جہنم میں جب ایک جگہ سے دوسری جگہ وہ منتقل کیے جائیں گے تو ہر جگہ ہی بدترین محسوس ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ نعمت ہو یا عذاب، اگر مستقل ایک جیسی ہو جائیں تو اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ لیکن قرآن کے اس مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اتنا تنوع ہوگا کہ جنت کا ہر مقام بہت اچھا اور جہنم کا بہت برا لگے گا اور یہی احساس جنت کو جنت اور جہنم کو جہنم بنائے رکھے گا۔ اہل جنت اپنی نعمتوں سے کبھی بور نہ ہوں گے اور اہل جہنم کبھی عذاب کے عادی نہ ہو سکیں گے۔

اسباب اور شرک

خدا کی دنیا ایک انتہائی خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں رنگ ہے، نور ہے، روشنی ہے، خوشبو ہے، جلوے ہیں، ذائقے ہیں اور زندگی ہے اور زندگی کو ممکن، آسان، پر لطف بنانے کے ہزار ہا سامان ہیں۔ یہ سب ایک ہی ہستی کے فیض کا ظہور ہے۔ اللہ رب العالمین۔

عجیب بات ہے کہ لوگوں کی اکثریت ہمیشہ دوسرے انسانوں کے فیض کا ذکر کرتی چلی آئی ہے۔ انھی کو ہر نفع و ضرر کا مالک مانتی آئی ہے۔ اکثر لوگ انھی کے در پر جا کر نذر پیش کرتے اور انھی کی شکر گزاری کو اپنی عقیدت کا مرکز بناتے ہیں۔

یہ رویہ غلط ہے۔ ہر پہلو سے غلط ہے۔ ہر سطح پر غلط ہے۔ انسان اسباب سے بلند ہو کر دوسرے انسان کو کچھ نہیں دے سکتا۔ انسان اسباب کے دائرے میں رہ کر ہی دوسرے انسان کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ جیسے ماں باپ اپنی اولاد کو پالتے ہیں۔ استاد طلباء کو علم دیتا ہے۔ اچھے حکمران عوام کو سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ ایسے سب لوگ بلا شبہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس بات کے حقدار ہیں کہ ان کا اعتراف کیا جائے۔ ان کا احسان مانا جائے۔

تاہم یہ صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہستی ہے جو اسباب سے بلند ہو کر دوسروں کو سب کچھ عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر مریض کا علاج کر سکتا ہے۔ شفا صرف اللہ دیتا ہے۔ وہ نہ دینا چاہے تو ساری دنیا کے ڈاکٹر مرض دور نہیں کر سکتے۔ وہ شفا دینا چاہے تو مریض بغیر دوا کے ٹھیک ہو جاتا ہے۔

یہی باریک فرق ہے جو نہ سمجھا جائے تو انسانوں کو شرک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لوگ انسانوں سے بے جا توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ مفاد پرست لیڈر مرنے والوں کے نام پر اپنی بڑی بڑی دکانیں بنا لیتے ہیں۔ عوام توہمات کی دنیا آباد کر لیتے ہیں۔ خدا اسباب سے بلند ہے۔ انسان اسباب کا پابند ہے۔ خدا اسباب تخلیق کرتا ہے اور انسان ان کو استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے خدا خدا ہے۔ اسی لیے انسان انسان ہے۔

اسباب اور الحاد

خدا کی دنیا اٹل قوانین پر چل رہی ہے۔ ہمیشہ سے چلتی رہی ہے۔ مگر پچھلے زمانے میں لوگ اسے دیوتاؤں اور بزرگوں کی کرشمہ سازی قرار دیتے رہے تھے۔ کوئی بارش کا دیوتا تھا تو کوئی روزی کا۔ کسی بزرگ کے ہاں سے اولاد ملتی تھی تو کوئی زندگی و موت کا مالک تھا۔ کسی کا فیض رزق بڑھاتا تھا تو کسی کی مدد ہر مشکل سے انسان کو نکال دیتی تھی۔

جدید سائنس نے آ کر ان سارے توہمات کا خاتمہ کر دیا۔ دنیا جن اصول و قوانین پر چل رہی ہے ان میں سے بیشتر معلوم ہو چکے ہیں۔ جتنا زیادہ سائنسی علم ترقی کر رہا ہے اتنا ہی انسان دنیا کے اسباب و قوانین کو سمجھ کر ان کو اپنے فائدے میں استعمال کر رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال میڈیکل سائنس کی ترقی ہے جس نے نجانے کتنی لاعلاج بیماریوں کا خاتمہ کر کے انسانی زندگی کو سکون اور آسانی سے بھر دیا ہے۔

مگر اس صورتحال کا ایک دوسرا نتیجہ بھی نکلا ہے۔ آج لوگ اسباب ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ جس طرح قدیم انسان مخلوق کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔ جدید انسان مخلوق کی ایک دوسری قسم یعنی اسباب کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اسباب ہمیشہ فیض بخش نہیں ہوتے۔ تباہی بھی اسباب کے ہاتھوں آتی ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر سارے اسباب مل کر اس دنیا میں زندگی کا فیض جاری کر رہے ہیں۔ سورج حرارت دیتا ہے، مگر وہ کون ہے جس نے اسے زمین سے اتنا دور کر رکھا ہے کہ اس کی آگ زندگی بنی ہوئی ہے، موت نہیں۔ ہوا سانس لینے کا ذریعہ ہے، مگر کون ہے جو اس میں صرف اتنی آکسیجن رکھے ہوئے ہے جو زندگی بخش ہے۔

یہی ہستی خدا کی ہستی ہے۔ وہ اسباب کا خالق ہے۔ اسی کا فیض ہے کہ اسباب نفع بخش ہیں۔ یہی خدا کے ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

خدا سے مانگتے رہنا کبھی ضائع نہیں جاتا

خدا زندہ ہے۔ اسے ہر چیز کی خبر ہے۔ اس کی رحمت یہ گوارا نہیں کرتی کہ کوئی فریادی اس کے در اقدس پر آئے اور وہ خالی ہاتھ چلا جائے۔ یہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ مگر انسانوں میں سے کم ہی لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ اس ناواقفیت کا سبب صرف اتنا ہے کہ لوگ اپنی محرومی کو یاد رکھتے ہیں، خدا کی عطا کو یاد نہیں رکھتے۔

انسانوں کا یہ عجیب المیہ ہے کہ نعمتوں کو محسوس کرنے اور انہیں یاد رکھنے کے معاملے میں انسانوں کی یادداشت آخری درجہ میں کمزور ہے۔ ہاں غم و آلام اور زندگی کی محرومیوں کا حساب کتاب رکھنے میں ہر شخص اتنا ماہر ہوتا ہے کہ ایک بھی محرومی اس کی یادداشت سے محو نہیں ہوتی۔ اس رویے کے ساتھ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان خدا کی کسی عطا کی قدر دانی کرے۔

خدا سے جب بھی مانگا جاتا ہے وہ سنتا ہے۔ جب اسے پکارا جاتا ہے وہ جواب دیتا ہے۔ مگر ہم انسان ہمیشہ خدا کو دنیا مانگ کر آزماتے ہیں۔ وہ دنیا جو عطا کے نہیں امتحان کے اصول پر بنی ہے۔ چنانچہ امتحان میں کبھی وہ مانگی ہوئی چیز ہی دیتا ہے، کبھی اس سے بہتر دیتا ہے۔ کبھی فوراً دے دیتا ہے کبھی کچھ وقت کے بعد دیتا ہے۔ کبھی اپنی عطا سے جھولی بھرتا ہے اور کبھی اپنی سکینت قلب پر اتار کر اس میں سکون و اطمینان بھر دیتا ہے۔ مگر وہ دیتا ضرور ہے۔ اسے مانگنے والوں کو نہ کہنا اچھا نہیں لگتا۔

کبھی خدا کو آزمانا ہو تو سچے دل سے ہدایت مانگ کر خدا کو آزمانا چاہیے۔ متاع دنیا تو بندے کی بہتری کے خیال سے روکی جاسکتی ہے۔ متاع آخرت روکنے میں کیا بہتری۔ ہدایت اور آخرت خدا ہر حال میں دیتا ہے۔ فوراً دیتا ہے۔ بس جھولی پھیلی رہنی چاہیے۔ تعصب چھوڑ دینا چاہیے۔ خدا ہر حال میں دیتا ہے۔ جو مانگا جاسکتا ہے وہ سب کچھ دیتا ہے کیونکہ خدا سے مانگتے رہنا کبھی ضائع نہیں جاتا۔

اسلام اور خواتین پر تشدد

کیا اسلام بیویوں پر تشدد کو جائز قرار دیتا ہے، یہ وہ بنیادی مسئلہ ہے جو قرآن مجید کے ایک طالب علم کے سامنے اس وقت آجاتا ہے جب وہ سورہ نساء کی آیت 34 کا مطالعہ کرتا ہے جس میں بظاہر عورتوں کو مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک اس معاملے کو سمجھنے کے لیے قرآنی آیات کا موقع محل سمجھنا ضروری ہے۔ میاں بیوی کے تعلق سے شوہروں کو جو اصل ہدایت دی گئی ہے۔ وہ اس آیت سے ذرا قبل اس طرح بیان ہوئی ہے۔

''ایمان والو! (اپنی بیویوں سے) بھلے طریقے کا برتاؤ کرو، اِس لیے کہ تمھیں وہ پسند نہیں ہیں تو ہوسکتا ہے کہ تم کوئی چیز ناپسند کرو اور اللہ اُسی میں تمھارے لیے بہت بڑی بہتری پیدا کردے۔'' (النساء4:19)

میاں بیوی کے تعلق میں یہ ہے وہ اصل آیت جو شوہروں کو حکم دیتی ہے کہ چاہے بیوی ناپسند ہو تب بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ اس کے بعد بیوی کو مارنے کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ کمزور انسان اس دنیا میں ہر دور میں تشدد کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ بیویاں اس ستم کا ہمیشہ نشانہ رہی ہیں۔ زمانہ قدیم کو تو چھوڑیے موجودہ دور میں امریکہ میں ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس کی سن 2000 کی رپورٹ کے مطابق 22.1 فی صد خواتین گھریلو تشدد کا شکار ہوئیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زمانہ قدیم میں کیا کچھ ہوتا ہوگا۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو ایک طرف گھر کا نظم برقرار رکھنے کے لیے بیوی کو شوہر کی موافقت پر ابھارنا ہے اور دوسری طرف مردوں کو تشدد سے باز بھی رکھنا ہے۔ چنانچہ اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء کی آیت 34 میں ارشاد فرمایا:

''مرد عورتوں پر قوام ہیں، اِس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اِس

لیے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ پھر جو نیک عورتیں ہیں، وہ فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اِس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔ اور جن سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، اُنھیں نصیحت کرو، اور اُن کے بستروں میں اُنھیں تنہا چھوڑ دو اور (اِس پر بھی نہ مانیں تو) اُنھیں سزا دو۔ پھر اگر وہ اطاعت کریں تو اُن پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک، اللہ بہت بلند ہے، وہ بہت بڑا ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف خواتین کو موافقت پر پوری طرح ابھارا ہے اور دوسری طرف شوہروں کی طرف سے مار پیٹ کے اس کام کو جو زمانہ قدیم کا عام دستور تھا ضوابط و قواعد کی ایسی بیڑیاں پہنا دیں کہ یہ تشدد نہیں رہتا بلکہ گھر بچانے کا ایک عمل بن جاتا ہے۔

اس ہدایت میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ ان کا تعلق عام خواتین سے بالکل نہیں ہے۔ بلکہ ان خواتین سے ہے جو نکاح کے سارے فوائد یعنی اپنی ضروریات کی ساری فراہمی کا فائدہ تو شوہر سے لینا چاہتی ہیں، مگر دوسری طرف سرکشی کا یہ حال ہے کہ گھر کے نظم کو برباد کرکے اور شوہر کے راز اور انسانی کمزوریاں سب کے سامنے کھول کر اسے رسوا کرنے کے لیے بھی تیار رہتی ہیں۔ یہ وہ خواتین ہیں جن کا مسئلہ اختلاف رائے، اپنی پسند و ناپسند نہیں ہے بلکہ بغاوت، مستقل نافرمانی اور شوہر کو رسوا کرنے کا ہے۔ ایسے میں شوہر کے لیے ایک راستہ فوری طلاق دینے کا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بچے ہو جانے کے بعد یہ راستہ آسان نہیں رہتا۔ چنانچہ ایسی خواتین کو پہلے مرحلے میں سمجھایا جائے گا۔ پھر شوہر جس غرض سے عورتوں سے شادی کرتے ہیں، اس کو بھی چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی بستروں میں ان سے الگ ہو جانے کا حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت سخت پیغام ہے جس میں شوہر بیوی کے حقوق تو دیتا ہے مگر اپنے حقوق چھوڑ دیتا ہے۔

اس کے بعد گھر بچانے کے لیے اور عورت کی نفسیات کو جھنجھوڑنے کے لیے ایک آخری راستہ

یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ان کو کچھ سزا دی جا سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نوعیت کو بالکل واضح کرتے ہوئے بتا دیا کہ یہ کسی قسم کا تشدد نہیں ہوگا بلکہ جیسے ایک ماں اپنے بچے کی تادیب کے لیے کچھ ہلکی پھلکی ضرب لگا دیتی ہے اتنا ہی معاملہ ہونا چاہیے۔ حدیث کے الفاظ 'غیر مبرح' کے ہیں یعنی وہ سزا جو پائیدار اثر نہ چھوڑے۔ (مسلم: رقم 2950)

اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان آیات کا تعلق عام خواتین سے ہرگز نہیں جیسے کہ قرآن واضح ہے کہ اصل ہدایت یہ ہے کہ بیوی چاہے ناپسند ہو تب بھی اس سے اچھا برتاؤ کرو۔ اس ہدایت کا تعلق کچھ سرکش خواتین سے ہے جو نکاح میں رہنا بھی چاہتی ہیں اور شوہر کے خلاف مستقل اعلان جنگ بھی کیے رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان کی اصلاح کے لیے یہ ایک لائحہ عمل دیا گیا ہے نہ کہ ان پر تشدد کے لیے۔ اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

رہی یہ بات کہ زیادتی اگر شوہر کر رہا ہو تو اس کو روکنے کا کیا طریقہ ہے۔ کیا ریاست کو اس میں مداخلت کرنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس کا بہتر حل وہ ہے جو خود قرآن مجید نے اگلی آیت یعنی 35 میں تجویز کر دیا ہے کہ دونوں کے خاندان کے بڑے بوڑھے آگے آئیں اور معاملات کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ یہ ریاست کی مداخلت سے بہتر راستہ ہے۔ تاہم اگر شوہر بیوی پر تشدد شروع کر دے تو پھر ریاست کو مداخلت کرنا ہوگی۔ پھر اس شخص کو سزا ملنی چاہیے۔ یہ سزا ایک شوہر کو نہیں ایک ظالم کو ملے گی۔ آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ اس آیت کا ایک واضح پیغام شوہروں کے لیے ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے اِن ابتدائی دو مراحل اور بیویوں کی بغاوت اور سرکشی کی کسی کیفیت کے بغیر محض غصے میں آ کر، معمولی اختلاف رائے پر بیویوں پر ہاتھ اٹھایا تو وہ اللہ کے مجرم ہیں۔ وہ بلند اور اعلیٰ ہستی جب کمزور بیویوں کی طرف سے حساب لے گی تو شوہروں کو اپنا غصہ اور تشدد بہت مہنگا پڑے گا۔

تراش خراش

باغبانی کا یہ قاعدہ ہے کہ پودوں کی تراش خراش سے وہ وقتی طور پر کم ہو جاتے ہیں مگر پھر تیزی سے بڑھتے ہیں۔ بعض اوقات اس کی کسی شاخ پر کیڑا لگ جاتا ہے تو اس کو کاٹ دیا جاتا ہے کہ کیڑا اور نہ پھیلے۔ یوں پورا پودا بچ جاتا ہے۔ اور وہ شاخ بھی دوبارہ بڑھنے لگتی ہے۔

یہی اس دنیا میں مصائب و آلام کے آنے کی ایک اہم وجہ ہے۔ یہ مصائب و آلام وقتی طور پر انسان کو پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ اس کی ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔ تاہم یہ مصائب اکثر حالات میں عارضی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لیکن انسان کی قوت برداشت، حوصلے اور ہمت، تجربے اور معلومات کو بڑھا جاتے ہیں۔ ایسا انسان دوبارہ زندگی کے میدان میں جب قدم رکھتا ہے تو پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔

تاہم انسان چونکہ درختوں سے مختلف ہے، اس لیے فطرت کے اس راستے میں اسے ایک کام کرنا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ مشکل حالات میں خود کو مایوس ہونے سے بچائے اور مستقبل کی امید پر اپنے حوصلہ کو بلند رکھے۔ وہ مشکلات کے سمندر میں امکانات کے ساحل پر نظر رکھیں۔ مگر اکثر لوگ مشکل حالات میں گھر کر منفی سوچ کو اپنی نفسیات کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ وہ ایک عارضی نقصان کو اپنی زندگی کا روگ بنا لیتے ہیں۔ وہ وقتی ناکامیوں سے گھبرا کر اپنے مستقبل سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ جس کے بعد ان کا جسم طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور ان کی نفسیات مستقل طور پر منفی ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں ان کی قوت عمل کو معطل کر دیتی ہیں۔ یوں بجائے ترقی کرنے کے وہ لوگ زندگی میں ہمیشہ کے لیے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مصائب کی درست نوعیت کو سمجھ لیا جائے کہ یہ ہمارا حوصلہ اور تجربہ بڑھانے آ رہے ہیں تو ان کو ہم ترقی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ نہ سمجھیں تو زندگی کا روگ بنا لیتے ہیں۔

خدا کی عطا

خدا اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت کا نام ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ بیشتر انسان اس حقیقت کو ماننے کے بجائے اس سے غافل رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک روز موت ان کی نگاہوں کا پردہ اٹھا دیتی ہے اور وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں خدا غیب سے ظاہر میں آ جاتا ہے۔ مگر اس روز خدا کو ماننا بے معنی ہو جاتا ہے۔

خدا اس دنیا کی ہر نعمت کا مالک ہے۔ وہ ہر کمال کا خالق اور ہر جمال کا صانع ہے۔ وہ ہر ذی روح کا رب اور وہ ہر شکل کا مصور ہے۔ اس نے سورج، چاند اور تاروں کو انسانوں کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ اس نے زمین و آسمان میں رحمتوں کے انبار لگا رکھے ہیں۔ اس نے اپنے بندوں کے لیے جمال و کمال کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہے جو معلوم کائنات میں کسی جگہ موجود نہیں۔

یہی نہیں جو بندے اس کو دل سے مان کر خود کو اس کے حوالے کر دیں وہ غیب میں ہوتے ہوئے بھی ان کی ہمیشہ دستگیری کرتا ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے، مگر ان کی سن کر مان بھی لیتا ہے۔ وہ سب کی خبر رکھتا ہے، مگر ان کی خبر گیری بھی کرتا ہے۔ وہ سب کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور ان کے لیے واقعتاً سب کچھ کر بھی دیتا ہے۔ وہ سب کو دیتا ہے مگر ان کو دیتا ہی چلا جاتا ہے۔

لیکن امتحان کی دنیا میں وہ یہ سب کچھ پردہ غیب میں رہ کر کرتا ہے۔ اس لیے اپنی رحمت کو ہمیشہ اسباب کے پردے اور تاخیر کے ڈھکنے میں ڈھانک کر انھیں دیتا ہے۔ اس لیے عام لوگوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ کس کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔

مگر ایک دن آئے گا جب وہ علانیہ اپنے بندوں کو نوازے گا۔ سب کے سامنے اور ان کی مرضی کے عین مطابق ان کو دے گا۔ خدا کی یہی شان عطا ہے جس کے لیے یہ دنیا اور آنے والی دنیا بنائی گئی ہے۔ قابل رشک ہیں وہ لوگ جنھوں نے خود کو اس کی عطا کا امیدوار بنا لیا ہے۔

تقدیر اور اجرِ آخرت

اے ٹی ایم مشین سے پیسے نکال کر جیسے ہی وہ صاحب باہر نکلے خاتون فوراً اندر داخل ہوگئیں اور میں دیکھتا رہ گیا۔ ہوا یہ تھا کہ میں اے ٹی ایم مشین بوتھ کے پاس پہنچا تو وہ صاحب مجھ سے قبل اپنی باری کا انتظار کررہے تھے۔ وہ سائے میں کھڑے تھے۔ میں ان سے ذرا دور دوپہر کی تیز دھوپ میں کھڑا ہوکر انتظار کرنے لگا۔ اسی اثنا میں خاتون اپنے دو بچوں سمیت گاڑی سے اتر کر باہر نکلیں۔ ان کے قریب آنے سے قبل بوتھ خالی ہوگیا اور مجھ سے آگے کھڑے صاحب اندر چلے گئے۔ خاتون قریب آئیں تو میں نے خود سائے میں جانے کے بجائے ان کو وہاں کھڑے ہونے کا موقع دے دیا۔ تاہم ان خاتون پر بھی یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگلا نمبر میرا ہی ہے۔

دھوپ میں انتظار کرتے ہوئے میں یہ طے کرچکا تھا کہ اب خود اندر جانے کے بجائے ان خاتون کو موقع دوں گا۔ مگر جب بوتھ کا دروازہ کھلا اور پیسے نکال کر وہ صاحب باہر نکلے خاتون فوراً اندر داخل ہوگئیں اور میں دیکھتا رہ گیا۔ مجھے افسوس ہوا۔ اپنے پیچھے رہ جانے پر نہیں۔ کیونکہ وہ تو میں پہلے ہی طے کرچکا تھا۔ افسوس ان کے پیچھے رہ جانے پر ہوا۔ انھیں وہی ملا جو اللہ تعالیٰ انھیں میرے ذریعے سے دینے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ مگر انھوں نے وہ اپنی چالاکی سے لینا چاہا۔ حق تلفی پر مبنی ایسی چالاکی انسان کو خدا کی نظر میں بہت پیچھے کردیتی ہے۔

اِسی مثال سے وہ قانون سمجھا جاسکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ اس دنیا کو چلا رہے ہیں۔ یہاں تمام فیصلے اللہ تعالیٰ خود کرتے ہیں۔ ان کے اسباب البتہ انسان جمع کرتے ہیں۔ ان اسباب کو جمع کرتے ہوئے وہ اخلاقی اصولوں کو پامال کریں گے تو ایسا نہیں ہوگا کہ اپنی تقدیر سے کچھ زیادہ لے لیں گے۔ انھیں ان کی تقدیر ہی ملے گی، لیکن آخرت کی پکڑ کے ساتھ۔ اور جو لوگ اخلاقی اصولوں کی پاسداری کریں گے۔ انھیں بھی ان کی تقدیر ہی ملے گی، مگر آخرت کے اجر کے ساتھ۔

اداروں کے دور میں بڑے آدمی

ہمارے ہاں بڑے آدمیوں کی کمی کا اکثر شکوہ کیا جاتا ہے۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے قانون کے مطابق بڑے آدمی ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں۔آج کے دور میں بھی پیدا ہورہے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں بڑے آدمی پیدا نہیں ہورہے، ہمارا المیہ یہ ہے کہ بڑے آدمی بہت چھوٹے لوگوں کے درمیان پیدا ہورہے ہیں۔ چنانچہ یہ چھوٹے لوگ کبھی کسی بڑے آدمی کا اعتراف کرتے ہیں نہ اس کی قدر دانی کرتے ہیں۔ بلکہ الٹا لٹھ لے کر ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔اور جب تک اسے قبر میں نہ دفنا دیں، اس کی بڑائی کا اعتراف نہیں کرتے۔ یوں ایک بڑا آدمی مرنے کے بعد ہی بڑا آدمی بن پاتا ہے۔چنانچہ ہمارے ہاں بڑے آدمی کو نمایاں ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا۔وہ کسی طرح نمایاں ہو بھی جائے تو اتنا بدنام ہو چکا ہوتا ہے کہ نہ اس کا کوئی ساتھ دیتا ہے، نہ اس کی خدمات کبھی نمایاں ہو پاتی ہیں۔

ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ یہ حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہم اداروں میں جی رہے ہیں۔اب معاشرے میں تبدیلی بڑے آدمی نہیں بلکہ ادارے لاتے ہیں۔ بلکہ بڑے آدمی کو بھی ادارے ہی وہ مواقع دیتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ کوئی نمایاں خدمت سرانجام دے پاتے ہیں۔سر دست ہم یہ ادارہ جاتی سپورٹ صرف کھلاڑیوں کو دیتے ہیں۔علم و دانش میں تو حال یہ ہے کہ کسی بڑی صلاحیت کے شخص کے سامنے پہلا مسئلہ باعزت روزگار حاصل کرنا ہوتا ہے۔

علم و دانش کی دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا بڑا آدمی ہمیشہ مختلف سوچتا ہے۔وہ اپنے زمانے سے آگے کا انسان ہوتا ہے۔ایسا آدمی نہ تو اخباروں میں روایتی صحافیانہ کالم لکھ سکتا ہے اور نہ کسی سیاست زدہ درس گاہ میں پڑھا سکتا ہے۔چنانچہ بہت سے بڑے لوگ بڑا کام کرنے کے بجائے معاشی تقاضوں کے ہاتھوں اپنی صلاحیتوں کو گنوا بیٹھتے ہیں۔

ایک سنت الٰہی

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ ان میں سے ایک آخری اور انتہائی طریقہ یہ ہے کہ کسی قوم اور اس کی لیڈر شپ کو دنیا کی رہنمائی کے منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے سے دنیا کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت ملتی رہتی ہے۔

شیاطین کے لیے یہ صورتحال بہت مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مشکل سے نجات پانے کے لیے وہ بطور خاص لیڈر شپ کو نشانہ بنا لیتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ لیڈر شپ مجموعی طور پر شیاطین کے مکر و فریب کا شکار ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد یہ لیڈر شپ دین کی اصل بنیادوں کے بجائے غیر متعلق چیزوں کو دین کے نام پر پیش کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے انبیا اور شہدا کو اٹھاتے ہیں۔ لوگ ان کی دعوت کا مثبت جواب دے دیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر ان پر لعنت کا فیصلہ کر کے ان کو اس منصب سے معزول کر دیا جاتا ہے۔

اس دعوت میں ابتدا میں دلائل کے ذریعے سے اپنی بات واضح کی جاتی ہے۔ سچائی اس طرح کھول دی جاتی ہے کہ انسان تعصب، خواہش اور مفاد کا اسیر نہ ہو تو اسے رد نہیں کر سکتا۔ تاہم دلیل کے جواب میں کوئی بھی بے معنی نکتہ آفرینی کی جا سکتی ہے، اس لیے عام لوگوں پر واضح نہیں ہو پاتا کہ کس کی بات ٹھیک ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ دوسرا مرحلہ شروع کرتے ہیں۔ اس میں پے در پے ایسے واقعات جنم لیتے ہیں جو لیڈر شپ کی اخلاقی حیثیت کو کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ لوگوں پر اس لیڈر شپ کا اخلاقی ننگا پن بھی بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بھی قوم اگر اسی لیڈر شپ کے پیچھے لگی رہے تو لیڈر شپ کے ساتھ قوم پر بھی لعنت کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ تاہم اگر قوم اپنی لیڈر شپ کو بدل دے تو اسے مہلت دے دی جاتی ہے۔ یہی قانون سابقہ امت مسلمہ میں جاری تھا، یہی قانون اس امت میں بھی جاری ہے۔

سیکولرازم اور ہم

مغرب کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ مغرب میں سیکولرازم کے فروغ کا ایک اہم سبب چرچ کا رویہ تھا۔ پاپائیت کے اندھیروں کے خلاف علم کی روشنی جب پھیلنا شروع ہوئی تو چرچ نے ہر ممکن حربہ استعمال کر کے اسے دبانا چاہا۔ شروع شروع میں تو ان کو کچھ کامیابی نصیب ہوئی، مگر وہ زمانہ کے انداز میں آنے والی تبدیلی کا اندازہ نہیں کر سکے۔

اہل علم کو مختلف سزائیں دینے سے لے کر ان کو جلاوطن کرنے، ان کے نظریات پر پابندی لگوانے، ان کی کتابیں سرعام جلانے، ان کے خلاف نفرت پھیلانے جیسے سارے اقدامات وقت کی تبدیل شدہ لہر کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ چرچ کی گرفت ڈھیلی ہونا شروع ہوئی اور ایک وقت آیا کہ اقتدار کے ایوان سے لے کر گھر کے آنگن تک ہر جگہ سے مذہب کو دیس نکالا مل گیا اور سیکولرازم غالب ہو گیا۔

اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب میں سیکولرازم اپنی فکری قوت کی بنیاد پر کم اور اہل مذہب کی اخلاقی اور فکری کمزوریوں کی بنا پر زیادہ فروغ پایا۔ کچھ جزوی تبدیلیوں کے ساتھ یہی معرکہ عالم اسلام کے مختلف خطوں میں برپا رہا ہے اور اب ہمیں اس کا سامنا ہے۔ ہمارے ہاں بھی سیکولرازم اگر پھیل رہا ہے تو اس کی وجہ اس کی فکری قوت نہیں، اہل مذہب کی اخلاقی اور فکری کمزوری ہے۔

ہمارے ہاں اہل مذہب نے کھل کر دہشت گردی کا ساتھ دیا ہے یا اس کی خاموش حمایت کی ہے۔ جن لوگوں سے اختلاف تھا، ہم نے ان کے خلاف بھرپور نفرت انگیز مہمیں چلائیں۔ خدا کی بات پہنچانے والوں کو قتل کر دیا یا ان کو ملک اور گھر چھوڑنے پر مجبور کیا ہے۔ اس کے بعد تاریخ بتاتی ہے کہ سیکولرازم آتا ہے اور مذہب بتاتا ہے کہ خدا کا عذاب آتا ہے۔ آج ہم نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کر کے توبہ نہیں کی تو سیکولرازم یا خدا کے عذاب میں سے کوئی ایک چیز ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مستقبل نہیں۔

پاکستانی پاسپورٹ

The Henley & Partners بیرون ملک رہائش اور شہریت میں مدد اور معلومات فراہم کرنے کا ایک ادارہ ہے۔ یہ ادارہ ہر سال ویزہ پابندیوں کے لحاظ سے ایک فہرست جاری کرتا ہے جس میں دنیا بھر کے ممالک کے پاسپورٹ کا جائزہ لے کر یہ بتایا جاتا ہے کہ مختلف ممالک میں بلاویزہ سفر کی آزادی کے لحاظ سے کس ملک کے پاسپورٹ کا کونسا نمبر ہے۔

اس ادارے کی سن 2015 کی فہرست کے مطابق پاکستانی پاسپورٹ دنیا بھر میں سب سے نیچے اور صرف صومالیہ، عراق اور افغانستان سے اوپر تھا۔ 2016 کی فہرست میں پاکستان کا مقام اور گر گیا صومالیہ اور عراق پاکستان سے بہتر ہو گئے۔ اب صرف افغانستان ہم سے نیچے رہ گیا۔ دنیا کا کوئی اہم تو کیا غیر اہم ملک بھی پاکستانیوں کو بلاویزہ داخلے کی اجازت نہیں دیتا۔ جبکہ ویزہ لینے کا عمل پاکستانیوں کے لیے ایک مہنگا اور ذلت آمیز تجربہ بن چکا ہے۔ غیر ملکی سفارت خانوں میں پاکستانیوں کی تذلیل اور بھاری فیس کے باوجود ویزہ دینے سے انکار معمول بن چکا ہے۔

یہ اس ملک کا حال ہے جو ایک ایٹمی پاور ہے۔ جو آبادی، رقبے، پیداوار، وسائل اور جائے وقوع کے اعتبار سے دنیا کا اہم ترین ملک ہے۔ جس کے باشندے اپنی ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر دنیا کے ہر اہم ملک میں قابل ذکر کمیونٹی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس پس منظر کے باوجود اقوام عالم میں اس ذلت اور رسوائی کا سبب کیا ہے۔ اس سوال کی بڑی تفصیل کی جا سکتی ہے، مگر گہرائی میں جائیں تو اس صورتحال کا باعث ہماری دو کمزوریاں ہیں۔ ایک بحیثیت قوم ہمارا تعلیم دشمن رویہ اور دوسرا غیر حقیقت پسندانہ اور جذباتی سوچ۔

تعلیم اس دنیا میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہر ترقی کا راز ہے۔ ہم میں سے ہر باشعور شخص آمدنی کا دس سے تیس فیصد حصہ بچوں کی تعلیم پر خرچ کر دیتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تعلیم کے

بغیر ہمارے بچوں کی زندگی برباد ہوجائے گی۔ مگر آزادی پر سات دہائیاں گزرنے کے باوجود بحیثیت قوم ہم تعلیم پر اپنے بجٹ کا دو فیصد سے زیادہ حصہ خرچ کرنے پر تیار نہیں۔

خیال رہے کہ جب تعلیمی بجٹ دو فیصد ہوتا ہے تو تعلیمی عمارتوں اور اساتذہ کی تنخواہوں کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہیں۔ مگر جب تعلیمی بجٹ بیس فیصد ہوتا ہے تو ہر گاؤں اور قریے میں اسکول ہی نہیں ہوتے بلکہ اعلیٰ تعلیمی ادارے، لائبریریز، تحقیقی مراکز اور شعور و آگہی کے ہزار سامان وجود میں آجاتے ہیں۔ مگر ہم قوم کو جاہل اور بے شعور رکھ کر اس کو برباد کر رہے ہیں۔

ہماری ذلت و بربادی کا دوسرا سبب ہماری غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔ ہم عملی طور پر مغربی اور مشرقی پاکستان کو تو متحد رکھ نہیں سکے لیکن نیل کے ساحل سے کاشغر تک مسلمانوں کے اتحاد کا نعرہ لگاتے نہیں تھکتے۔ ہم اپنی عدالتوں اور تھانوں میں کسی کمزور اور غریب کو تو انصاف دلا نہیں سکتے، مگر دنیا بھر کے مسلمانوں کو سپر پاور سے انصاف نہ ملنے پر برہم رہتے ہیں۔ ہماری نظریں کابل اور لال قلعے کو فتح کرنے پر لگی رہتی ہیں مگر جونا گڑھ سے لے کر حیدرآباد دکن اور ڈھاکہ سے لے کر کارگل تک جو کچھ ہوا اسے دیکھنے کے لیے ہماری نظریں بہت کمزور ہیں۔ اپنی کمزوریوں اور مسائل کو چھوڑ کر دوسروں کے معاملات میں الجھنا غیر حقیقت پسندی کی آخری حد ہے اور بدقسمتی سے یہی ہمارا محبوب قومی مشغلہ ہے۔

اس صورتحال میں کچھ لیڈروں کی دکان ضرور چمکتی رہے گی۔ وہ اور ان کے ہمنوا یہی چاہیں گے کہ یہاں جہالت اور غیر حقیقت پسندی کا چلن عام رہے۔ مگر درحقیت تعلیم کی کمی نے ہماری ترقی کی راہیں مسدود کر رکھی ہیں۔ جبکہ غیر حقیقت پسندانہ سوچ نے ستر برسوں میں ہمارے بجٹ اور قومی مزاج دونوں کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان دو اسباب کے ہوتے ہوئے ہم اپنی نظروں میں کتنے ہی ہیرو بن جائیں، دنیا کی نظروں میں ہم ذلیل و رسوا رہیں گے۔ وہ سبز پاسپورٹ جو ہمارے لیے عزت کا باعث بن سکتا تھا، ذلت اور رسوائی کا باعث بنا رہے گا۔

غیر متعلق گفتگو

میری دعوتی زندگی پر اب کم وبیش ربع صدی کا وقت گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصہ میں ہدایت کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ میں نے دیکھی ہے وہ کسی معقول بات کے جواب میں غیر متعلق گفتگو کرنے کی عادت ہے۔ یہ عادت کیا ہوتی ہے، اس کی ان گنت مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لیکن دو حالیہ مثالیں میں ذاتی تجربے سے قارئین کے سامنے پیش کیے دیتا ہوں جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مرض کیا ہوتا ہے۔

کچھ عرصے پہلے میں نے فیس بک پر اپنا ایک تاثر درج کر دیا کہ خواتین پر مسجد کے دروازے بند نہیں ہونے چاہییں۔ لوگوں نے اس بات کو بہت پسند کیا لیکن کچھ لوگوں کی طرف سے ایک غیر متعلق بحث چھیڑ دی گئی۔ وہ یہ کہ خواتین کے لیے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ میرے تاثرات میں اس بات کا کوئی ذکر نہ تھا کہ خواتین کے لیے نماز کہاں پڑھنا افضل ہے۔ بحث یہ تھی کہ اس کا کیا شرعی جواز ہے کہ خواتین پر مساجد کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ جبکہ یہ کام اللہ اور اس کے رسول نے نہیں کیا۔ بلکہ صحیح ترین روایات میں عید میں خواتین کی حاضری کو لازمی کیا گیا ہے اور عام نمازوں میں حکم ہے کہ خواتین مسجد جانا چاہیں تو ان کو نہ روکا جائے۔ مگر یار لوگوں نے اصل بات کا کوئی جواب نہ پا کر قارئین کو گمراہ کرنے کے لیے ایک دوسری بحث اٹھا دی۔

ایک دوسری مثال پاکستانی پاسپورٹ کے حوالے سے لکھے گئے اس مضمون کی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ویزہ کی پابندیوں کے لحاظ سے پاکستانی پاسپورٹ دنیا بھر میں افغانستان کے بعد سب سے کم وقعت رکھتا ہے۔ اور یہ کہ دنیا کے کسی اہم یا غیر اہم ملک میں پاکستانیوں کو بنا ویزہ داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر اس صورتحال کی وجوہات پر کچھ گفتگو کی گئی تھی۔

یہ مضمون فیس بک پر شائع ہوا تو اس پر ایک صاحب نے ایک دفعہ پھر ایک غیر متعلق بحث

چھیڑ دی۔ یعنی جس ادارے نے یہ رپورٹ بنائی اس پر لعن طعن، مغربی ممالک کو برا بھلا کہا یا یہ کہ پھر تو انڈیا چلے جانا چاہیے۔ اس طرح کی غیر متعلق اور لایعنی گفتگو کرنا ہمارے ہاں کے جذباتی لوگوں کا عام طریقہ ہے۔ حالانکہ معقول جواب یہ ہوتا کہ اعداد و شمار پیش کر کے یہ بتایا جاتا کہ فلاں فلاں ممالک میں پاکستانیوں کو بغیر ویزہ داخلے کی اجازت ہے اور مصنف کی بات خلاف حقیقت ہے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

اس طرح کی غیر متعلق گفتگو کرنے والے لوگوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دلیل وہ سمجھتے نہیں ہیں اور اپنی غیر متعلق اور لایعنی گفتگو کو گلا پھاڑ کر اور بار بار پورے اعتماد سے دہرا دینے کو دلیل کے قائم مقام سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک مدلل بات کو اپنی بے معنی چیخ و پکار سے متنازعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسی معقول بات کو غیر متعلق اعتراضات سے متنازعہ بنانے کی یہ ٹیکنیک پرنٹنگ پریس کے دور تک تو بہت کامیاب تھی، مگر اب انفارمیشن ایج میں فیس بک وغیرہ پر جب نامعقولیت کا نامعقولیت ہونا فوراً واضح کیا جا سکتا ہے تو یہ ٹیکنیک زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ کیونکہ ایک تیسرے قاری کے سامنے دونوں طرف کی باتیں فوراً آ جاتی ہیں اور وہ ایک واضح فیصلہ کر لیتا ہے۔ تاہم اس کا ایک نقصان ابھی بھی ہوتا ہے۔

وہ نقصان یہ ہے کہ اس طرح کی غیر متعلق باتوں کا جواب دینے میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایک ایسے معاشرے میں جہاں اس طرح کی لایعنی گفتگو پورے اعتماد کے ساتھ کرنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہو۔ ایسے میں سنجیدہ لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود آگے بڑھ کر ایسی فضولیات کی غلطی واضح کر دیا کریں۔ ایسے مواقع پر خاموش رہنا دراصل شیطان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

غلامی کا خاتمہ

غلامی دور جدید میں ایک نا قابل تصور چیز بن چکی ہے۔ تاہم معلوم انسانی تاریخ میں یہ انسانی معاشروں کا ایک لازمی حصہ رہی ہے۔ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص جب قرآن مجید میں غلامی کا ذکر دیکھتا ہے تو اسے سخت حیرت اور صدمہ ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ چیز اسلام کی حقانیت پر شبہ کا سبب بن جاتی ہے۔

جو لوگ اس حد تک نہیں جاتے ان کے ذہن میں بھی اس حوالے سے بہت سے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ قرآن مجید نے جس طرح شراب اور سود کو بتدریج حرام قرار دیا غلامی کو بھی صراحت کے ساتھ حرام قرار دے دیا جاتا۔ اس میں کیا حرج تھا۔

یہ ایک بہت معقول سوال ہے۔ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ایسا نہ کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ غلامی نہ صرف انسانی معاشرے کی لازمی ضرورت بن چکی تھی بلکہ اس کے عرف میں داخل ہو کر فکری جواز حاصل کر چکی تھی۔

غلامی کا آغاز تاریخ میں اس وقت ہوا جب انسان زرعی دور میں داخل ہوا۔ جنگ و جدل میں جو قیدی پکڑے جاتے وہ قتل کر دیے جاتے۔ وقت کے ساتھ لوگوں کو احساس ہوا کہ قیدیوں کو قتل کرنے کے بجائے اگر ان کو زندہ رکھ کر زرعی زمینوں اور گھروں میں کاموں کے لیے استعمال کر لیا جائے تو قیدیوں کو زندگی کا حق مل جائے گا اور فاتحین ان کی خدمات سے فائدہ اٹھالیں گے۔ چنانچہ غلامی کا سلسلہ ظلم کی ایک کم تر شکل کے طور پر شروع ہو گیا۔ یہیں سے اسے فکری اور اخلاقی جواز مل گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ لونڈی غلام خدمت گزاروں کے طور پر معاشرے کی ناگزیر ضرورت بن گئے۔ جس کے بعد بردہ فروشی شروع ہو گئی۔ قبائلی دور میں جو مرد یا عورت اپنے قبیلے سے جدا

ہوتی یا جو قبیلہ کمزور ہوتا اس کے افراد کو پکڑ کر غلام بنالیا جاتا اور بڑے شہروں میں فروخت کر دیا جاتا۔ قبائلی عصبیت اور حمایت سے محرومی کے بعد کسی لونڈی غلام کے لیے یہ سوچنا بھی ممکن نہ تھا کہ وہ دوبارہ ایک آزاد زندگی گزار سکے۔ وہ کسی طرح آزاد ہو بھی جاتا تو تنہا نہ اپنے تحفظ پر قادر تھا نہ اس دور میں ایسے معاشی مواقع دستیاب تھے کہ وہ خود سے آزاد زندگی گزارنے کا سوچ سکتا۔ اس کا مالک اس کے ساتھ جو کچھ بھی سلوک کرتا، اس کی واحد پناہ گاہ اور واحد کفیل تھا۔ بردہ فروشی کے علاوہ تاوان اور قرض کی عدم ادائیگی، قتل کی دیت اور کسی جرم کی سزا کے طور پر بھی فرد کی آزادی سلب کر کے اسے کسی کی غلامی میں دے دیا جاتا۔ یوں سماج نے ہر پہلو سے غلامی کو اپنالیا۔

ایسے میں غلامی کے مکمل خاتمے کے لیے انسانوں کے سماجی، معاشی اور فکری نظریات میں تین تبدیلیاں آنا ضروری تھیں۔ پہلی یہ کہ آزادی کو انسان کا سب سے بڑا حق مان لیا جائے اور ہر قیمت پر اس کا تحفظ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ معاشرہ اس بات کو یقینی بنا تا کہ ہر شخص کے روزگار کا یقینی انتظام کیا جاتا۔ تیسرا یہ کہ دنیا قبائلی تمدن سے نکل کر بین الاقوامی معاہدات کے اس دور میں پہنچ جائے جہاں دنیا ایک بین الاقوامی قانون بنانے کے قابل ہو جاتی۔

ان تینوں تبدیلیوں کے بغیر اگر سارے لونڈی غلام ایک حکم سے رہا کر دیے جاتے تو بیشتر غلام خود ہی رہائی لینے سے انکار کر دیتے۔ خاص کر ایک اسلامی معاشرے میں جہاں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک ایک دینی مطالبہ تھا۔ غلاموں کے نزدیک آزادی سے زیادہ ایک دولت مند مالک کی خدمت کر کے چھت، لباس اور خوراک کی یقینی فراہمی زیادہ اہم تھی۔ وہ آزادی حاصل کر لیتے تو روزگار نہ ملتا اور کسی اور علاقے میں جاتے تو دوبارہ غلام بنالیے جاتے۔

اس لیے اسلام نے ایک فطری انداز اختیار کیا۔ اور یہ حق غلاموں کو دے دیا کہ وہ معاوضہ

دے کر آزادی حاصل کر لیں۔ اسلام کے اس حل میں یقیناً مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کے ساتھ کچھ عملی خرابیاں در آئیں۔ لیکن مذکورہ بالا تینوں تبدیلیوں کے بغیر ایسا کوئی حکم دینا کار لاحاصل تھا۔

دور جدید میں مغرب کے علمی اور صنعتی انقلاب نے ان تینوں پہلوؤں سے سماج کو بدل دیا۔ آزادی دور جدید میں سب سے بڑی انسانی قدر قرار پا گئی۔ یہ اسی فکری تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ آج لوگ غلامی کا نام سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ ورنہ زمانہ قدیم میں اسے ہر طرح کا اخلاقی اور قانونی جواز حاصل تھا۔ چنانچہ اسی پس منظر میں دنیا نے غلامی کو عظیم ترین ظلم سمجھنا شروع کر دیا۔ دوسرے یہ کہ صنعتی انقلاب نے بڑے پیمانے پر ملازمت کے مواقع پیدا کر دیے۔ ہر غلام کے لیے موقع تھا کہ وہ آزادی کے بعد کسی نہ کسی طرح اپنی گزراوقات کا بندوبست کر لے۔ تیسرے یہ کہ بین الاقوامی ریاستی معاہدات نے رفتہ رفتہ پوری دنیا کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ہاں غلامی کو ختم کر دیں۔

اس لیے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات پر کسی قسم کا اعتراض اٹھانا قرآن مجید ہی سے نہیں اس بات سے بھی بے خبری کا ثبوت ہے کہ انسانی معاشرے کیا ہوتے ہیں اور کن اصولوں پر چلتے ہیں۔

شکر گزار دل

میری کوشش ہوتی ہے کہ جہاں ممکن ہو، میں کسی پیدل چلنے والے کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اس کی منزل تک لفٹ دے دیا کروں۔ پچھلے دنوں ایک صاحب کو میں نے لفٹ دی۔ ان کا رویہ عام لوگوں سے بہت مختلف تھا۔ انھوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی انگریزی میں میرا شکریہ ادا کیا۔ گرچہ یہ انگریزی غلط تھی۔ اس کے بعد گاڑی میں ان سے مزید گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوگیا کہ گرچہ وہ ایک بہت کم تعلیم یافتہ دیہاتی پس منظر کا نوجوان ہے مگر تہذیب یافتہ ہے۔ بار بار اس نے مختلف پہلوؤں سے میرا شکریہ ادا کیا۔

ایک دیہاتی کم تعلیم یافتہ نوجوان جو شہری کلچر میں ڈھلنے کی کوشش کر رہا ہو اور غیر فصیح انگریزی کا جملہ کہیں سے سن کر بار بار دہرا رہا ہو، بظاہر شہری لوگوں کے ہاں مذاق کا موضوع بن جاتا ہے۔ مگر اس کے اندر جو شکر گزاری کا احساس تھا وہ اس کی پوری شخصیت پر حاوی ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اس کی منزل پر اتارا تو مجھے اس کی گفتگو سے زیادہ اس کی شخصیت کا یہ پہلو یاد رہ گیا۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم میں سے ہر شخص کی حیثیت اس نوجوان کی سی ہے۔ ہم جب اللہ کی نعمتوں کا بہترین طریقے سے بھی شکر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی شان کے مقابلے میں ہم ایک گنوار، جاہل اور بے وقعت انسان سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔ مگر اس کے باوجود وہ قرآن میں یقین دلاتے ہیں کہ میں اپنی شان کو نہیں تمھارے دل کو دیکھتا ہوں۔

ایسے میں جو بندہ اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرے وہ اس کی ہر کمزوری کو بالائے طاق رکھ کر اسے اپنے محبوب بندے اور بندی کے طور پر یاد رکھتے ہیں۔ وہ اس کی خطاؤں سے چشم پوشی کرتے اور اپنی نعمتیں بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اس کے بے وقعت الفاظ اور شکریہ کو نہیں اس کے دل کو دیکھتے ہیں۔ یہی شکر گزار دل خدا کا مطلوب ہے مگر یہی دل اکثر ناپید ہوا کرتا ہے۔

وجود خداوندی پر ایک دلیل

فلسفے کی ایک شاخ Ontology ہے۔ اس میں حقیقت، وجود اور ذات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ خدا کی ذات کے ہونے پر فلسفیوں نے جو دلائل دیے ہیں ان میں سے ایک دلیل فلسفے کی اسی شاخ کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کا ہر ماننے والا اور ہر منکر چونکہ خدا کی ہستی کا تصور کرسکتا ہے، جو سب سے بلند و اعلیٰ ہے، چنانچہ یہ تصور ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خارج میں بھی موجود ہے۔

یہ دلیل پہلی دفعہ گیارہویں صدی عیسوی میں مسیحی علم الکلام کے ایک بہت بڑے عالم اور فلسفی سینٹ انسلم نے پیش کی تھی۔ اس کے بعد سترہویں صدی میں جدید مغربی فلسفے کے بانی رینے ڈیکارٹ نے اس دلیل کو مزید آگے بڑھایا اور واضح کیا کہ جب ذہن خدا کی ہستی کا تصور کرسکتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ موجود ہے۔ تاہم مجموعی طور پر فلسفیوں نے اس دلیل کو رد کیا ہے جن میں ہیوم اور کانٹ جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ اس دلیل کو رد کرنے کی وجوہات بالکل سادہ ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ تصور تو کسی بھی چیز کا کیا جاسکتا ہے۔ تو کیا صرف تصور ذہن میں آنے سے خارج میں بھی کسی چیز کا ہونا لازمی ہوجاتا ہے۔ یعنی آپ کا اپنے بینک اکاؤنٹ میں لاکھ روپے کا تصور کرنے سے اس میں لاکھ روپے نہیں آجائیں گے۔ اس پس منظر میں یہ اعتراض بالکل درست ہے اور یہ دلیل ناقابل قبول ہے۔

تاہم اس فلسفیانہ بحث سے قطع نظر اس عاجز نے دلائل قرآن مجید پر اب تک جو تحقیق کی ہے اس کی روشنی میں خیال ہے کہ سینٹ انسلم نے درحقیقت یہ نکتہ قرآن مجید کی ایک دلیل سے لیا تھا، مگر اسے زیادہ بہتر طریقے پر پیش نہیں کرسکے۔ سورہ اعراف کی آیت 172 میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں آنے سے قبل اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا اور ان کو اپنے حضور جمع

کر کے ان سے اپنے رب ہونے کا عہد لیا۔اس کے بعد قرآن بیان کرتا ہے کہ اسی عہد کی بنیاد پر قیامت کے دن انسانوں کے لیے لاعلمی اور ماحول کا اثر کوئی عذر نہیں بن سکے گا۔

اس آیت سے جو بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا وجود انسانوں کی فطرت میں ہے۔کوئی خارجی قرینہ نہ ہوتب بھی ایک خالق و مالک کا تصور فطرت انسانی کی پکار ہے۔اس کے برعکس کسی خدا کا نہ ہونا یا بہت سی ہستیوں کا خدا ہونا انسانی فطرت کے لیے ایک اجنبی چیز ہے۔ چنانچہ خارجی تصورات سے بلند ہوکر داخلی تصور کی بنیاد پر انسانی فطرت کو ایک خدا، کئی خدا یا خدا کے نہ ہونے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا تو ایک خدا کا تصور اس کا فطری انتخاب ہوگا۔

یعنی بات یہ نہیں ہے کہ انسانی ذہن کسی چیز کا تصور کرسکتا ہے یا نہیں، اور جواب یہ دیا جائے کہ تصور تو کسی بھی چیز کا کیا جا سکتا ہے۔اہم اور اصل بات یہ ہے کہ ایک خدا کا تصور اور اس کی ہستی سرتا سر ایک داخلی تصور ہے جو خارج سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ خدا کی ضرورت اور اس کا تصور انسان کے اندر سے جنم لیتا ہے۔ یہ انسانوں کے لیے کسی پہلو سے کوئی اجنبی چیز نہیں۔اسی بنا پر یہ ہر دور میں انسانیت کی مشترکہ میراث رہا ہے۔اور انسانوں نے ہمیشہ اس تصور کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کیا ہے۔

کسی وجہ سے اگر انسانیت یہ تصور کبھی گم کر بیٹھے یا اس میں ملاوٹ کر دے، تب بھی انسان جیسے ہی سخت مشکلات میں گھرتے اور اپنے تعصّبات سے بلند ہوتے ہیں، وہ فوراً ایک خدا کے تصور کی طرف لپکتے ہیں۔وہ چاہے خدا کا انکار کریں، مگر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ خدا کا تصور ان کے داخل کے لیے ایک اجنبی تصور ہے۔ ہر انسان اپنی فطرت میں ایک خدا کے تصور سے مانوس ہے۔چاہے وہ اس کا کتنا ہی انکار کردے۔یہی خدا کے ہونے کا وہ ثبوت ہے جو خود انسانوں کے اندر موجود ہے۔فلسفیوں نے غلط طور پر اسے وجودی دلیل یا انٹالوجیکل آرگومنٹ کہا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ فطرت کی دلیل ہے۔

ہاں خدا کے اس تصور کو بعض لوگ نہیں مانتے، مگر اس وجہ سے نہیں کہ یہ ان کی فطرت کے لیے ناقابل قبول ہے بلکہ ان کے انکار کا ایک سبب یہ ہے کہ خدا کے نام پر جو مشرکانہ اوہام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ انسانی عقل اور فطرت دونوں کے لیے ناقابل قبول ہیں۔ چنانچہ انسان باطل کو رد کرتے کرتے حق کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ انسان خدا کی ذات اور اس کے تصور سے دو اور چیزوں کی توقع رکھتا ہے جو اس دنیا میں امتحان کی وجہ سے پوری نہیں کی جاسکتیں۔ ان دو چیزوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پھر ساری گمراہی پیدا ہوتی ہے۔

پہلی یہ کہ خدا کے تصور کے ساتھ انسان فطری طور پر اسے دیکھنے کے خواہاں بھی ہیں۔ اور دوسری یہ ہے کہ انسان خدا کو خدا کی حیثیت میں جانتا ہے۔ وہ خدا جو خبیر ہے، بصیر ہے، عادل اور رحیم ہے۔ اس کا یہ تقاضہ ہے کہ خدا اس دنیا کے معاملات میں فوراً مداخلت کر کے غلط چیزوں کو ٹھیک کرے۔ یہ دونوں مطالبات فطرت بالکل ٹھیک ہیں۔ مگر جیسا کہ بیان ہوا کہ یہ دونوں چیزیں حالت امتحان کی وجہ سے پوری نہیں کی جاسکتیں۔ اگر انسانوں کے یہ دونوں فطری تقاضے بھی پورے کر دیے جائیں تو پھر امتحان ختم ہو جائے گا۔ پھر اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکے گا کہ غیب میں رہ کر خدا کا وفادار کون بنتا ہے۔ چنانچہ خدا ان دونوں مطالبات کے جواب میں یہ بتاتا ہے کہ ان کی تکمیل آخرت کی زندگی میں ہوگی۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ امتحان برپا کرنا بھی معاذ اللہ کوئی خدا کی کمزوری یا اس کا عجز نہیں کہ اسے امتحان کے بغیر پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کا وفادار کون ہے اور کون خواہش، مفاد اور تعصب کا بندہ۔ وہ اپنے علم کی بنیاد پر یہ چیز اچھی طرح جانتا ہے۔ اسی نے جبرائیل کو جبرائیل بنایا ہے۔ اس نے میکائیل کو میکائیل بنایا ہے۔ اسی طرح وہ کسی امتحان کے بغیر ہی نبی کو نبی، صدیق کو صدیق،

محسن کو محسن اور صالح کو صالح بنا کر جنت میں بھیج سکتا تھا۔

مگر عہد الست کے بعد اس دنیا کے امتحان کو برپا کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خود انسانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو کہ کسی کو جنت میں اعلیٰ مقام دیا گیا تو کیوں دیا گیا۔ کوئی پیچھے رہا تو کیوں پیچھے رہا اور کوئی جہنم میں گرا تو کیوں گرا۔ ظاہر ہے کہ جب امتحان برپا ہوتا ہے تو ہر انسان دیکھ لیتا ہے کہ کون ہے جس نے زیادہ قربانی دی۔ کون ہے جس نے نیکی کی زندگی اختیار کی۔ کون ہے جس نے خواہش، تعصب، مفاد، فرقہ واریت اور گروہی عصبیت سے اوپر اٹھ کر حق کا ساتھ دیا۔

چنانچہ عہد الست کے بعد اسی مقصد کے لیے یہ دنیا بنائی گئی۔ پھر اسی مقصد کے لیے روزِ قیامت برپا کیا جائے گا اور ہر شخص کو بتا دیا جائے گا کہ اس نے کیا کیا اور دوسرے بھی جان لیں گے کہ کسی کے ساتھ جو کچھ ہوا تو اس کی وجہ کیا تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کا تصور ہماری فطرت میں ہے۔ یہ قرآن کا آرگومنٹ ہے۔ سینٹ انسلم نے شاید قرآن کی بات سنی ہوگی، مگر پوری طرح سمجھے بغیر اسے ایک دلیل بنا کر پیش کر دیا جس کے بعد سے ہزار برس سے سارے فلسفی اس کی تائید اور تردید میں لگے ہوئے ہیں۔

عہد الست

قرآن مجید کی سورہ اعراف آیت 172 سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی زندگی سے قبل تمام انسانوں کو ایک ساتھ پیدا کیا اور ان کو اپنے رب ہونے پر گواہ بنایا۔ قرآن مجید کا اسلوب بالکل واضح ہے کہ یہ ایک حقیقی واقعہ تھا کوئی تمثیلی پیرایہ بیان نہیں۔ آیت کا آغاز ہی ''واذ'' کے الفاظ سے ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ ''اور یاد کرو جب''۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ جگہ جگہ تاریخی واقعات کے بیان ہی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ اگلی آیت میں قرآن مجید اس واقعہ کو بطور حجت بیان کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن یہ کہو کہ ہم اس سے غافل تھے یا یہ کہ شرک تو ہمارے آباؤ اجداد نے کیا اور ہم اپنے پیدائشی حالات کی بنا پر شرک کا شکار ہو گئے۔

گویا قرآن مجید یہاں اس عذر کی نفی کر رہا ہے جو کوئی انسان حالات کے جبر کا شکار ہو کر اللہ کی بارگاہ میں پیش کر سکتا ہے۔ یعنی لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ گرچہ خدا کے رسول نے ہمیں واضح عقلی دلائل کی شکل میں توحید کی دعوت دی تھی، مگر چونکہ شرک ہمارے آبائی ماحول کی بنا پر ہماری فطرت کا حصہ بن چکا تھا، اس لیے ہم نے توحید کی اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ بتا رہے ہیں کہ تمھاری فطرت میں توحید کا پیغام بھی اِسی قوت کے ساتھ موجود تھا۔ جو تم نے ایک عہد کی شکل میں خود پورے شعور کے ساتھ قبول کیا تھا۔ اس لیے تمھارے پاس خارج کی دعوت حق کو رد کرنے کا کوئی عذر نہیں ہے۔

اس کے بعد جو بات کہی جا سکتی ہے کہ کسی کو یہ واقعہ یاد ہی نہیں تو یہ حجت کیسے بن سکتا ہے؟ تاہم یہ اعتراض غیر متعلق ہے۔ یہاں ماضی کا کوئی یاد رہ جانے والا واقعہ زیر بحث نہیں بلکہ وہ واقعات زیر بحث ہیں جن سے انسان کے لاشعور کی تشکیل ہوتی ہے۔ دور جدید میں علم نفسیات

نے اس چیز کو بہت نمایاں کر دیا ہے کہ انسان کے مزاج وطبیعت کی تشکیل میں ایک بہت اہم عامل ماضی کے وہ واقعات ہیں جو انسان کو یاد نہیں رہتے۔ یعنی اس کی زندگی کے بالکل ابتدائی چند سال۔ کسی انسان کو یاد نہیں رہتا کہ شروع کے تین چار برسوں میں اس کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے تھے۔ مگر اس کا مزاج انھی واقعات کا مرہون منت ہوتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ اس خاص واقعہ کا ہے۔ اسے انسانی یادداشت سے مٹا دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اگر اللہ کے حضور پیش ہو کر ایک اقرار کرنے کا واقعہ یاد رہتا تو پھر امتحان ختم ہو جاتا۔ تاہم اس واقعے نے انسانی فطرت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اسی کی بنا پر ہر انسان کے اندر ایک برتر ہستی، ایک خالق، ایک رب کی طلب رہتی ہے۔ اسے خدا کے تصور سے اپنے اندر کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ شیطان یہ کرتا ہے کہ اس فطری پیاس کے جواب میں اسے توحید کے ماءِ مصفا کے بجائے شرک کی غیر فطری شراب پلا دیتا ہے۔ مگر اس سے اس کی فطری پیاس نہیں بجھتی۔ انسان متعصب نہ ہو تو توحید کی دعوت کو اپنے دل کی صدا سمجھ کر قبول کرتا ہے۔

دور جدید میں ایک دوسرے پہلو سے یہ چیز نمایاں ہوئی ہے۔ انیسویں صدی میں مسیحی انتہا پسندی کے جواب میں مغرب میں رد مذہب کی تحریک پیدا ہوئی اور آخر کار خدا کا انکار کر دیا گیا۔ کمیونزم کا ایک پورا فلسفہ وجود میں آیا جس نے بالجبر مذہب کو انفرادی زندگی سے بھی نکالنے کی کوشش کی۔ مگر دو صدیوں کی تمام کوششوں کے بعد بھی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انسان خدا کے بغیر نہیں جی سکتا۔ ان دو صدیوں میں یہ انسان کی اندرونی فطرت تھی جو عہد الست سے پیدا ہوئی تھی اور جس نے الحاد کے جبر کا پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ عہد الست اگر کوئی تمثیل ہوتا تو فطرت سے محو ہو جاتا۔ مگر یہ واقعہ ایک حقیقت تھا اس لیے نہیں مٹ سکا۔ خدا کو ختم کرنے کا دعویٰ کرنے والے ختم ہو گئے۔ خدا ختم نہیں ہوا۔ وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ عہد الست اسی حقیقت کا بیان ہے۔

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

[اپنی پیدائش کے دن مبارکباد دینے والے متعلقین اور دوستوں کو لکھا گیا ایک مضمون]

کتاب زندگی کا ایک اور ورق تمام ہوا......ہجر کی ایک اور رُت بیت گئی۔

یہ زندگی کیا ہے؟ اپنے مالک کے حکم پر اس سے دور رہ کر جینا ہے۔اس کے قدموں کی مہک......اس کے تلووں کے لمس کو چھوڑ کر بستی ہجر کو اذن رب پر آباد کرنا ہے۔

آہ کہ ہم غافل اس حقیقت کو بھول کر اِسی دنیا کو اپنا گھر سمجھنے لگتے ہیں۔کوئی ہم نادانوں کو سمجھائے کہ سرائے کو گھر سمجھنے والوں کو ایک دن رخصت کا پروانہ تو ملتا ہے، مگر متاع حیات سمیٹنے کا موقع نہیں ملتا۔ان بدنصیبوں کی کُل کمائی سرائے فانی میں رہ جاتی ہے......اس بستی ہجر میں اذن ِسفر یکدم ہی ملا کرتا ہے۔سو جو سامان باندھے بیٹھا ہے، وہ تو زادِسفر لے لے گا......اور جو غافل رہا، جاہل رہا، کاہل رہا......اس کے لیے کچھ بھی نہیں، نہ یہ جہاں نہ وہ جہاں۔

پروردگار کے حکم پر اِس دنیائے دوں کے شعلہ بار دنوں میں جلنا اور بستی ہجر کی یخ بستہ راتوں میں بجھتے اور سلگتے رہنا ایک عجیب داستان ہے۔لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ رحمٰن نے انسان کو کیوں بنایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ نہ بناتا تو یہ داستانِ ہجر اعلی مرتبت سردار جبریل لکھ پاتے نہ عالم آب و ِگل کے چلتے، اڑتے، تیرتے مکیں صفحہ ہستی پر تحریر کر پاتے۔اگر دل میں احساس خلیل اللہ ابراہیم کی طرح زندہ ہو تو تنہا یہی شرف، زندگی کی ہر آگ کو گل وگلزار بنانے کے لیے بہت ہے...... یہ الگ بات ہے کہ رحمٰن اس قرض کو اس طرح اتارے گا کہ ابراہیم اور آل ابراہیم کو ابدی طور پر بادشاہی کی خلعت فاخرہ عطا کر دے گا۔اور دل میں احساس نہیں تو یہی دنیا بہت جہنم ہے۔خَسِرَ الدُّنیَا وَالْآخِرَةَ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ۔

خسارہ پانے والوں کو چھوڑیے جو ہماری نگاہ میں بہت اور البصیر والخبیر کی نگاہ میں بہت کم

ہیں۔اس عالم فانی کو گھر کے بجائے بستی ہجر سمجھنے والوں کی طرف آیئے جو بہت کم ہو کر بھی سب کچھ ہیں۔ یہ دو طرح کے ہیں۔ایک وہ جو فراق کی آگ میں جلتے، بجھتے اور سلگتے رہتے ہیں۔ان کی حیات پرسوز کو پروین سلطانہ حناؔ نے کمال سادگی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

دن...... مہینہ سال میں ڈھلتا رہا
وقت کا پہیہ یونہی چلتا رہا
تجھ کو کیا معلوم تیرے ہجر میں
اک دیا جلتا رہا بجھتا رہا

ان کا مقصود اس دل کو پانا ہوتا ہے جو اپنی ہستی قربان کر کے بھی مل جائے تو نقصان کا سودا نہیں۔

جل گئی مزرع ہستی تو اگا دانۂ دل

دوسرے وہ ہیں جن کا ذوق شاعر مشرق کی طرح ہوتا ہے جو محبوب حقیقی سے بے تکلفی کا مکالمہ کرنے کی جرات رکھتے تھے:

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یہ صاحبان جنوں وہ ہیں جو دنیائے آب گل میں خالق آب و گل کی مرضی کے پھول کھلانا چاہتے ہیں۔انہیں وصال یار سے زیادہ، خیال سے زیادہ......گیسوئے یار سلجھانے کی فکر ہوتی ہے۔مگر یہ کام لمبا ہے۔سو انہیں وصال کی جلدی نہیں۔سلگتے وہ بھی ہیں،مگر اقبال کی طرح یار کو انتظار کا مشورہ دے کر،اپنے اندر کی آگ سے پتھروں کو جونک لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

میں اب عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں آقائے دو جہاں کو انذار عام کا حکم دیا گیا تھا۔

يَـا أَيُّهَـا الْـمُدَّثِّرُ ۔قُمْ فَأَنذِرُ ۔ وَرَبَّكَ فَـكَبِّـرُ ۔وَثِيَـابَكَ فَـطَهِّـرِ۔وَالرُّجزَ فَاهْجُرُ ۔وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ۔وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرُ ۔(المدثر 74:1--7)

''اے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھنے والے، اٹھو اور انذارِ عام کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اپنے رب ہی کی کبریائی کا اعلان کرو۔ اپنے دامن دل کو پاک رکھو، (اردگرد پھیلی) غلاظت سے دور رہو اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر بیٹھو اپنے رب کے فیصلے کے انتظار میں ثابت قدم رہو''۔

اِس حکم سے قبل آقائے دو جہاں حبِ الٰہی کے سوز میں ڈوب کر سیرت و شخصیت کی آخری عظمتوں کو تخلیق کرتے اور اپنے قریبی لوگوں کو مالک دو جہاں کے قدموں میں لا کر ڈالتے رہے۔ انذارِ عام کا حکم آیا تو حبِ الٰہی کا یہ شعلہ بھڑکا اور عرب کا کوئی کچا پکا گھر نہ بچا جو نورِ الٰہی سے روشن نہ ہو گیا۔ پھر عالم عجم پر رحمتوں کا یہ بادل برسا اور ہر بنجر زمین کو سیراب کر گیا۔ سلام ہو محمد اور آل محمد پر جس طرح سلام ہوا ابراہیم اور آل ابراہیم پر۔

اب وقت آ گیا ہے کہ کُل عالم نورِ نبوت سے روشن ہو جائے۔ امت کا آخری حصہ اٹھے اور پوری انسانیت پر اسی طرح برسے جس طرح پہلا حصہ عالم عجم پر برسا تھا۔ گو صاف نظر آتا ہے کہ پہلے والوں میں سے یہ بہت تھے اور پچھلے والوں میں سے بہت کم ہوں گے۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ۔ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۔

میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنے اپنے طریقوں سے یہ کرنا بھی چاہتے ہیں۔ مگر جب میں ان کو اور پھر سرکار دو عالم کو ملنے والے حکم کو دیکھتا ہوں تو طبیعت پراگندہ ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ قُمْ فَأَنذِرُ ۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرُ کو اپنے سفر کی منزل سمجھ بیٹھے ہیں۔ نادان یہ نہیں جانتے کہ یہ کام تو اللہ کراتا ہے۔ بندے کی اپنی نجات آگے بیان کردہ کاموں میں ہے۔ یہاں کسی کو یہ بھی نہیں خبر کہ آگے کیا کہا گیا ہے: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرِ۔وَالرُّجزَ فَاهْجُرُ ۔ وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ۔وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرُ ۔

شخصیت میں ہر آلودگی، اخلاق میں ہر پستی، ہمت میں بے حوصلگی اور طبیعت میں بے صبری کے ساتھ خدا کی مرضی نہ پہلے کبھی بیان ہوسکی ہے نہ آج ان لوگوں سے یہ خدمت لی جائے گی۔ خدا کی کبریائی ایسے لوگ نہ پہلے قائم کر سکے نہ آج کر سکیں گے۔

یہ سب لکھ کر خیال آتا ہے کہ میں ان سب سے کیسے مختلف ہوں......

عجب سانحہ ہے کہ انسان کے حق میں سب سے معتبر گواہی اس کی اپنی ہوتی ہے اور وہی گواہی ......اس معاملے میں سب سے بڑھ کر مردود ہوتی ہے۔ہاں مگر صاحبانِ بصیرت کہتے ہیں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ایک استاد، ایک داعی کس طرح کے لوگ پیدا کر رہا ہے......وہی اس کی جدوجہد کے حق و باطل کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی اپنی قوم پر سچی تھی اسی لیے وہ اصحاب پیدا ہوئے جن کی گواہی کل عالم کے لیے معتبر ٹھہری۔

سو میرے دوستو! مجھے مبارکباد اس وقت دیجیے جب آپ کے اندر خدا کی مرضی عام کرنے اور اس کی کبریائی بیان کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔آپ اپنے دامنِ دل......اپنی شخصیت کو پاکیزہ سے پاکیزہ تر بناتے جائیں۔ایمان اور اخلاق کی ان نجاستوں سے آپ خود کو بچا رہے ہوں جو ایک سیلابِ بلا کی صورت ہر گھر کے درپے ہیں۔دین کے لیے اپنی کسی سعی کو آپ آخری جان کر بیٹھنے والے نہ ہوں اور ہر بہتان تراش، جھوٹے اور دغا باز کی باتوں پر صبر کرنے والے نہ بن جائیں۔

آپ اس راستے پر پہلا قدم رکھ دیجیے۔پھر مجھے مبارکباد دیجیے۔ورنہ روزِ قیامت میری اور آپ کی رسوائی کا منظر ایک سا ہوگا۔اقبال نے یہ کہا تو کسی اور پس منظر میں تھا۔مگر اس پہلو سے بھی یہ شعر نقل کرنا غلط نہیں۔

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

”جب زندگی شروع ہوگی“ کی اصل محرک کا انتقال

”میں تہجد میں اٹھ کر یہ دعا مانگ رہی ہوں کہ میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔“

اس دنیا میں کس میں یہ حوصلہ ہے کہ کسی غیر سے یہ بات کہے۔مگر مجھ سے یہ جملہ کہنے والی دینی بہن بہت چھوٹی عمر میں اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے خالق و مالک کے حضور لوٹ چکی ہے۔

یہ سن دو ہزار دس کی ابتدا کا ذکر تھا۔ میں ”جب زندگی شروع ہوگی“ مکمل کر چکا تھا۔مگر اس کی اشاعت کے حوالے سے میں ایک گومگو کی کیفیت میں تھا۔پھر ایک روز اچانک پتہ چلا کہ مجھے ایک مہلک مرض نے آ گھیرا ہے۔میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ اگر میری زندگی کا اختتام ہے تو پھر یہ کتاب ایک امانت ہے جسے لوگوں تک ہر حال میں پہنچنا چاہیے۔سو اس کی اشاعت کا فیصلہ کر لیا گیا۔

اس کا فون آیا تو اسے اس فیصلے سے مطلع کیا تو بہت خوش ہوئی۔ وجہ اشاعت یہ بتائی کہ مرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔اس پر بہت دل گرفتہ ہوئی۔ وہ جملہ کہا جو اوپر نقل ہوا ہے۔میں اس بات پر بہت ناراض ہوا۔مگر کیا کیجیے وہ جینے کا ارادہ شاید پہلے ہی چھوڑ چکی تھی۔ شاید اس وقت جب میں نے ”جب زندگی شروع ہوگی“ کے ابتدائی چند ابواب اسے پڑھنے کے لیے بھجوائے تھے۔

یہ چند ابواب بس ایسے ہی رواروی میں بیٹھ کر لکھ دیے تھے۔انہیں کسی مکمل کتاب کے قالب میں ڈھالنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔مگر اس تک پہنچے تو اس کی دنیا تلپٹ ہوگئی۔ وہ اتنی حساس تھی کہ شدت تاثر سے بیمار پڑ گئی۔فون پر کہا کہ اب زندہ رہنے کا دل نہیں چاہتا۔ میں نے سمجھایا کہ جنت کا راستہ موت کی خواہش سے نہیں، خدا کے لیے زندہ رہنے سے ملتا ہے۔اس کو سمجھ آ گیا۔ ٹھیک ہوئی تو میرے پیچھے لگ گئی کہ کتاب پوری کریں۔اصرار اور طرف سے بھی تھا، مگر اس نے

تو ناک میں دم کر دیا تھا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے وہ کتاب مکمل کرا ہی دی جس نے نجانے کتنے لوگوں کو آخرت کی زندگی سے متعارف کرایا۔ اور اب اس کتاب کی تکمیل کی اصل محرک خود اس دنیا کا حصہ بن چکی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔

وہ بے حد حساس تھی۔ جتنی حساس تھی اتنے ہی زندگی میں دکھ جھیلے تھے۔ شادی شدہ تھی۔ مگر شادی شدہ زندگی جن سکھوں سے عبارت ہوتی ہے وہ اس کی زندگی میں موجود نہیں تھے۔ وہ اپنا ہر دکھ مجھے سناتی تھی۔ میں صبر کی تلقین کرتا۔ مگر وہ گھلتی گئی۔ جلتی ہوئی شمع کی طرح پگھلتی گئی۔ اور ایک روز ہمیشہ کے لیے یہ شمع بجھ گئی۔

اس کی زندگی بھی ایک شمع کی مانند تھی۔ ہمیشہ دوسروں کے دکھوں کے لیے پریشان رہتی۔ ہر طرح سے دوسروں کی مدد کرتی۔ دین کا ذوق اور فہم بہت اچھا تھا۔ خواتین میں دین کی اتنی اچھی سمجھ میں نے شاذ ہی کبھی دیکھی تھی۔ اس کے اردگرد کے سارے لوگ اس سے دینی سوالات کرتے۔ وہ جواب دے دیتی۔ پھر احتیاطاً مجھے فون کر کے کنفرم کرتی کہ صحیح بات بتائی ہے یا کوئی غلطی کی ہے۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس نے کسی کو غلط جواب دیا ہو۔ میں اس کی زندگی میں آنے والی ہر محرومی کے جواب میں یہ کہتا کہ اللہ نے تمھیں دنیا داری کے لیے نہیں دین کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

مطالعے کی بے حد شوقین تھی۔ جیب خرچ میں ملنے والی بیشتر رقم کتابیں خریدنے پر خرچ کر دیتی اور شوہر سے بہت ڈانٹ کھاتی۔ زندگی کے آخری دنوں میں ایک روز اس نے مجھے فون کیا۔ وہ بہت دکھی ہوتی تو مجھے ہی فون کرتی تھی۔ وہ مطالعہ نہیں کر پا رہی تھی کہ چشمہ ٹوٹ گیا تھا اور شوہر سے بار بار کہہ رہی تھی کہ چشمہ بنوا دو۔ جواب میں اسے تھپڑ کھانے کو ملا۔ یہ واقعہ سنا کر وہ بہت روئی۔ میں نے اسے بہت تسلی دی لیکن اِس روز فون بند کر کے میں بھی رو پڑا۔

وہ اپنے شوہر سے دیوانہ وار عشق کرتی تھی۔شوہر نے دوسری شادی کا ارادہ کرلیا۔وہ یہ برداشت نہیں کرسکی۔خود کو روگ لگا بیٹھی۔ بڑے حوصلے سے شوہر کی دوسری شادی کو دیکھا۔ شادی کی ساری شاپنگ خود کرائی۔مگروہ اتنی بہادر نہیں تھی جتنی نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔اس لیے چند ماہ بھی نہ جی سکی۔گرچہ دوسری لڑکی بھی اچھی تھی۔مگروہ شرکت گوارا کرنے کی روادار نہیں تھی۔ میں نے شادی سے پہلے ہی بہت سمجھایا تھا کہ شوہر کو دوسری بیوی کے حوالے کر کے خود کو اللہ کے لیے وقف کردو۔ مجھے معلوم تھا کہ اللہ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کی ضرورت تھی کہ اس کا دھیان دوسری سمت بٹ جائے۔کاش ہمارے خطے کی خواتین یہ سمجھ لیں کہ شوہر اتنا قیمتی نہیں ہوتا کہ اس کے لیے اپنی جان کو روگ لگایا جائے۔زندگی میں شوہر کے سوا بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔مگراس کی زندگی میں اور کچھ تھا بھی نہیں۔ میں کتنی باتوں کا راز داں ہوں،مگراس نے وعدہ لیا تھا کہ خاموش رہوں گا۔سو میں خاموش ہی ہوں۔

میرے لیے بس ذاتی اطمینان کی ایک ہی بات ہے۔اس نے ہمیشہ مجھ سے دوسروں کے لیے مدد مانگی تھی۔اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔بلکہ الٹا میرے اور میری بیوی بچے کے لیے تحفے بھیجتی رہتی تھی۔آخری دنوں میں جب ڈاکٹروں نے ہسپتال سے جواب دے کر گھر بھیج دیا تھا تو اپنی بہن کے ذریعے سے اس نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں اسے وہیل چیئر خرید کر لے دوں۔وہ اسلام آباد میں تھی اور میں ہزار میل دور بیٹھا تھا۔پھر بھی میں نے ایک اور دینی بہن فریدہ سے رابطہ کر کے اس کے گھر بھیجا۔فریدہ نے جو حالات بتائے اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب اسے وہیل چیئر کی کوئی ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔مگرایک بھائی کو بہرحال بہن کا مان رکھنا تھا۔بھلا ہو برادرم ندیم اعظم کا کہ انھوں نے میرے ایک فون پر اگلے ہی دن وہیل چیئر اس کے پاس پہنچوادی۔

پھر آج اس کی وفات کے ایک ہفتے بعد فریدہ کو معلوم ہوا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ دنیا چھوڑ کر جا چکی ہے۔ ایک گہرے کرب نے مجھے گھیر لیا ہے۔ یہ وہ دن ہیں جب ایک دفعہ پھر میں ہزاروں برس پر پھیلی فلسفے کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ فلسفی ہر چیز کا جواب برا بھلا دے رہے ہیں۔ مگر ایک چیز ان کے احاطہ تصور سے باہر ہے۔ یہ آخرت کی وہ زندگی ہے جس کے بغیر اس دنیا کی کسی پہیلی کو سلجھایا نہیں جا سکتا۔ اس دنیا میں دکھ کیوں ہیں؟ موت کیوں ہے؟ اعلیٰ انسان اس قدر بے بسی سے زندگی گزار کر کیوں مر جاتے ہیں؟

باخدا آخرت نہ ہو تو خدا پر ایمان لانا بھی ممکن نہیں۔ یہی ایمان ہے جو کرب کے ان لمحات میں مجھے یقین دلا رہا ہے کہ مرنے والی نے اپنے بدترین دن دیکھ لیے ہیں۔ اس نے صبر اور تقویٰ کی قرآنی شرائط کے مطابق زندگی گزاری۔ نیکی اور احسان کو اپنا شیوہ بنایا۔ ایسے لوگوں کے لیے جنت کی یقین دہانی خود اللہ پروردگار عالم نے اپنے کلام میں کرائی ہے۔

اس لیے رب کریم کی رحمت سے امید ہے کہ اب اس کی زندگی میں کوئی دکھ اور کوئی محرومی نہیں آئے گی۔ رحمت خداوندی نے فردوس بریں میں اسے رب سے نزدیک جگہ دے دی ہے۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ میں حضرت آسیہ کی طرح اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اپنے پاس میرا گھر بنا دیں۔ ایسے دکھی لوگوں کی دعا اللہ تعالیٰ ضرور سنتے ہیں۔ اس لیے اس کا گھر بنا دیا گیا تھا، مگر وہ گھر ہی کیا جس میں مکین نہ ہو۔ اس کی موت کے فیصلے سے مجھے لگا کہ گویا مالک ذوالجلال نے فیصلہ کر لیا کہ اس بے رونق گھر کو رونق بخش دی جائے۔ سو گھر والی کو بلا لیا گیا۔ یہ اس کی موت نہیں ہے۔ اس کی زندگی اب شروع ہوئی ہے۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

لاٹری

لاٹری جوئے کی ایک قسم ہے۔اس میں بہت سارے لوگ تھوڑے سے پیسے دے کر ایک ٹکٹ خرید لیتے ہیں۔خریداروں کی تعداد بعض اوقات لاکھوں میں ہوتی ہے۔پھر ان ٹکٹوں کی قرعہ اندازی ہوتی ہے۔جس شخص کے ٹکٹ کا نمبر قرعہ اندازی میں نکل آتا ہے اسے ایک بہت بڑی رقم مل جاتی ہے۔جبکہ باقی لوگوں کی رقم ضائع ہوجاتی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ اسلام میں جوا اور اس کے نتیجے کے طور پر لاٹری حرام ہے، ہمارے ہاں لاٹری کے حوالے سے ایک محاورہ وجود میں آگیا ہے کہ فلاں شخص کی لاٹری نکل آئی۔اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تقدیر اس شخص پر مہربان ہوگئی اور وہ اچانک ترقی کر کے فرش سے عرش پر جا پہنچا۔گویا کہ لاٹری نکلنے کا محاورہ انتہائی خوش نصیبی کے لیے بولا جاتا ہے۔

ہم انسانوں کو یہ بات نہیں معلوم مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہم جس حیثیت میں موجود ہیں اس میں ہم سب کی لاٹری نکلی ہوئی ہے۔ہم ایک ایسی کائنات میں زندہ ہیں جو لامحدود طور پر وسیع اور ختم نہ ہونے والے خزانوں کی حامل ہے۔اللہ تعالیٰ نے ایک روز یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی مخلوق کو اس کائنات کا بادشاہ بنادیں گے۔اللہ تعالیٰ کی لاکھوں کروڑوں مخلوقات میں سے اس مقصد کے لیے انسانوں کا انتخاب کرلیا گیا۔یوں گویا کہ ہم انسانوں کی لاٹری نکل چکی ہے۔

انسانوں کو بس کرنا یہ ہے کہ گنتی کے چند سال اللہ کو دیکھے بغیر اس کی عبادت کریں اور اس کی بات مانیں۔یوں سمجھئے کہ لاٹری نکلنے کے دن سے لے کر انعام پانے کے درمیانے وقت میں خود پر قابو رکھنے کی بات ہے۔اس کے بعد کائنات کے سارے خزانے آپ کے قدموں میں ڈھیر ہوں گے۔تو چلیے اب خوش ہوجائیے اور خوشیاں منائیے کہ آپ کی لاٹری نکل آئی ہے۔بس تھوڑا سا صبر اور تھوڑا سا شکر۔یہ بادشاہی آپ کی ہوئی۔

مقام لذت مقام اذیت

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسانوں کے ساتھ فضل و کرم کا عجیب معاملہ کر رکھا ہے۔ یہاں انسان کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان ضروریات میں لذت کا ایسا خزانہ رکھ دیا گیا ہے جس کے لمس سے کوئی بھی دوسری مخلوق نا آشنا ہے۔

مثال کے طور پر انسانوں کی غذا کو لے لیجیے۔ غذا زندگی برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہے۔ یہ ضرورت دیگر جانداروں کی طرح بہت سادہ انداز میں بھی پوری کی جا سکتی تھی۔ مگر انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ذوق لذت کی تسکین کے لیے دنیا میں انواع و اقسام کے کھانے، ذائقے اور مشروبات رکھ دیے گئے ہیں۔ کھٹے، میٹھے، نمکین، مصالحہ دار۔ ان لذیذ کھانوں کو انسان اپنے منہ کے ذریعے سے پیٹ تک پہنچا کر توانائی کا خزانہ حاصل کرتا ہے۔ اس عمل میں زبان جو ذائقہ محسوس کرتی ہے اور ذہن اس سے جس طرح لذت اٹھاتا ہے وہ بلاشبہ ایک معجزاتی عمل ہے۔

لذتِ کام و دہن کی یہ دنیا ایک عذاب میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس کی سادہ ترین مثال یہ ہے کہ جب کسی شخص کے منہ میں چھالے پڑ جائیں، السریشن سے منہ کے اندر کی جلد خراب ہو جائے، گلے میں تکلیف ہو جائے یا خدانخواستہ منہ یا گلے کا کینسر ہو جائے تو یہی کھانا منہ میں رکھنا اور گلے سے اتارنا ایک عذاب بن جاتا ہے۔ ایسے میں ایک لقمہ اور ایک قطرہ آب منہ سے نیچے اتارنا ایک قیامت خیز مرحلہ ہے۔ جو عمر بھر مقام لذت رہا وہ ایک مقام عذاب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی اس دنیا کی باقی لذتوں کی داستان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ وہ تمام انسانوں کو ساری زندگی نعمتوں اور لذتوں سے مالا مال کیے رکھتے ہیں۔ مگر جو لوگ یہ نعمت پا کر غفلت اور نافرمانی کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک روز ان کے ہر مقام لذت کو مقام عذاب بنا دیا جائے گا۔ یہ دن وہ ہو گا جب قیامت کے بعد تمام

انسانوں کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا۔ پھر ہر مجرم وسرکش کو جہنم رسید کیا جائے گا۔

شکرگزاری کے بجائے سرکشی کی راہ اختیار کرنے والے ان مجرموں کو کھانے اور پینے کے لیے خاردار جھاڑیاں، خون، پیپ، کھولتا ہوا پانی، زقوم اور اس نوعیت کی دیگر بدمزہ اور تکلیف دہ چیزیں دی جائیں گی۔ یہ چیزیں ان کے منہ، گلے اور پیٹ کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالیں گے۔ ایک ایک گھونٹ، ایک ایک لقمہ عذاب کی ایک نئی شدت لیے ان کا منتظر ہوگا۔ مگر ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوگا۔ بھوک ان کو مجبور کرے گی اور وہ اس کی اذیت سے بلبلا کر اس کھانے کی اذیت کو گلے لگانے پر مجبور ہوں گے۔

اس کے برعکس کچھ اور لوگ جنت کی پر کیف بستی میں ہمیشہ کے لیے بسا دیے جائیں گے۔ ہر لمحہ ایک نئی لذت سے ان کا تعارف ہوگا۔ کھانے اور پینے کی ہر چیز وہاں سرور، کیف، مستی، ذائقے اور لذت کے ایک نئے پہلو سے ان کو روشناس کرائے گی۔ وہاں کی شراب ان کے سر میں درد کرے گی نہ ہوش وحواس سے بے گانہ کرے گی۔ وہاں کے کھانے نہ بدہضمی پیدا کریں گے نہ حوائج ضروریہ کا باعث بنیں گے۔ نہ پیٹ میں گرانی ہوگی نہ سینے میں جلن ہوگی۔ نہ کھانا کم پڑے گا نہ پیٹ بھرنے کی وجہ سے ہاتھ روکنے پر مجبور ہوں گے۔

یہ جنت صرف انھی لوگوں کا مقدر ہے جو گزشتہ دنیا میں اپنے تعصّبات اور جذبات سے بلند ہوکر ایمان کو اختیار کرنے والے بنے۔ اپنے پیدائشی مذہب، روایتی فرقے اور ابتدائی نظریات سے بلند ہوکر سچ کی پیروی کرنے والے بنے۔ اپنی عملی زندگی میں اعلیٰ اخلاق کی پیروی کرنے والے اور صبر وشکر سے زندگی گزارنے والے بنے۔ انھوں نے جان لیا کہ ان کا وہ مالک کتنا کریم ہے جس نے ہر مقام اذیت کو مقام لذت بنا رکھا ہے۔ ان کی یہی دریافت حمد وتسبیح کے ان نغموں میں ڈھل جاتی ہے جسے سننے کے لیے آسمان وزمین ترستے ہیں۔ مگر یہی نغمے آج کا غافل انسان گانے پر تیار نہیں ہے۔

دنیا کی مشکل

ہم میں سے ہر شخص مشکلات سے گھبراتا ہے اور آسانی پسند کرتا ہے۔ لیکن مشکلات اس دنیا کی تخلیقی اسکیم کا لازمی حصہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ جگہ اس بات کو بیان کرتے ہیں یہ دنیا انسانوں کے امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس امتحانی پرچہ کے حصے ہیں۔ ایک نعمتیں اور دوسری مشکلات۔ چنانچہ مشکلات سے مفر ممکن نہیں۔

تاہم اس حقیقت کے باوجود کہ دنیا میں مشکلات اور مسائل ناگزیر ہیں، چند چیزیں ایسی ہیں جن سے یہ مشکلات آسان کی جاسکتی ہیں۔ پہلی اللہ تعالیٰ کی صفت حکیم پر یقین رکھنا ہے۔ مشکلات میں یہ یقین انسان کو بتاتا ہے کہ زندگی کی ہر مشکل کی ایک وجہ اور حکمت ہے۔ یہ حکمت ہمارے ہی فائدے کے لیے ہے۔ مگر چونکہ ہم کو علم نہیں ہوتا تو ہم مشکل سے گھبرا جاتے ہیں۔

اس کو دو مثالوں سے سمجھیں۔ پہلی مثال اس نوبیاہتا لڑکی کی ہے جس کی شادی پر کچھ عرصہ گزر جائے اور اس کے ہاں اولاد نہ ہو۔ ایسی لڑکی کے ہاں جب اولاد کی تمہید بنتی ہے تو اس کی ساری علامات بیماری کی ہوتی ہیں۔ مگر جیسے ہی اصل حقیقت کی خبر ہوتی ہے وہ لڑکی اور اس کے متعلقین پریشان ہونے کے بجائے خوش ہو جاتے ہیں۔ نو مہینے میں عملی طور پر حاملہ کی کیفیت ایک بیمار مریض سے مختلف نہیں ہوتی۔ مگر متوقع اولاد کی خوشی اور ان کیفیات کے عارضی ہونے کی بنا پر وہ بخوشی اس مشکل صورتحال کو برداشت کرتی ہے۔

یہی معاملہ مشکلات اور ناگوار حالات کا ہے۔ دنیا کی ہر مشکل عنقریب آخرت کی بہت بڑی آسانی میں بدلنے والی ہے۔ مگر ہم صورتحال کو اس پہلو سے نہیں دیکھتے۔ ہم نہیں سوچتے کہ مشکل کا ہر لمحہ حشر اور آخرت کی کسی نہ کسی سختی کو ہم سے دور کر رہا ہے اور جنت کی کسی نہ کسی نعمت کو بڑھا رہا ہے۔ مگر جیسے ہی ہمیں اس حقیقت کا یقین ہو جائے گا ہم ایک حاملہ لڑکی کی طرح مشکل کو

بھی خوشی کے ساتھ برداشت کرنے کے عادی ہوجائیں گے۔ ہم مسائل اور پریشانیوں کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے، مگر اسے اپنے ذہنی سکون کو منتشر کرنے کا سبب نہیں بنائیں گے۔ جو ہو سکے گا ہم کریں گے اور باقی معاملہ اللہ پر چھوڑ کر مطمئن ہوجائیں گے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہمارا جو معاملہ ہمارے ہاتھ میں نہیں رہتا وہ اس ہستی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو بہت کریم و رحیم ہے۔

مشکلات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ زندگی کی اکثر مشکلات ایسی ہوتی ہیں، جن میں آخرت ہی نہیں بلکہ دنیا میں بھی ہمارا ہی فائدہ ہوتا ہے۔ مگر عام طور پر ہم نہیں جانتے کہ یہ مشکل دراصل کتنی بڑی مشکل سے ہمیں بچا رہی ہے۔ اس کی مثال اس بچے کی ہے جسے ویکسینیشن کا ٹیکہ یا بیماری میں دوا کا کڑوا گھونٹ جب دیا جاتا ہے تو وہ چیخ و پکار شروع کر دیتا ہے۔

مگر ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کڑوا گھونٹ اور سوئی کی چبھن درحقیقت موت، معذوری، اور مرض کی تکلیف سے بچانے اور جسم کی راحت کے لیے ناگزیر ہے۔ یہی معاملہ زندگی کے بہت سے مسائل کا ہوتا ہے۔ ان مسائل کے ذریعے سے بھی اللہ تعالیٰ ہم کو زندگی کے بہت سے بڑے اور تباہ کن مسائل و مشکلات سے بچا لیتے ہیں۔ مگر ہم چونکہ ان زیادہ بڑے مسائل سے واقف نہیں ہوتے، اس لیے مشکلات پر نالاں رہتے ہیں۔

تاہم اللہ تعالیٰ کی تربیت کا یہ طریقہ ہے کہ بعض اوقات وہ ہماری یا دوسروں کی زندگی میں ایسے واقعات دکھا دیتے ہیں جن سے واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے تھے وہ بری تھی اور جس مشکل سے ہم بہت پریشان تھے وہ دراصل بہت بڑی خیر تھی۔ اس حکمت کو جان لینے کے بعد باقی معاملات میں ہمیں اپنی سوچ کو درست کر لینا چاہیے۔ جس شخص نے یہ اندازِ فکر اختیار کر لیا، اس کے لیے دنیا کی مشکل کو سہنا آسان ہوجاتا ہے۔ مشکلات کبھی اس کو زیر نہیں کر پاتیں۔ اس کا حوصلہ نہیں توڑتیں۔ یہی سوچ وہ مثبت سوچ ہے جس کی ہم سب کو ضرورت ہے۔

دعا اور حکمت عملی

اللہ تعالیٰ ہماری بعض دعائیں قبول کیوں نہیں کرتا، یہ وہ سوال ہے جو اکثر عام لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی زیادہ اہم ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ صاف فرماتے ہیں۔

''تمھارے رب کا فرمان کہ مجھ کو پکارو، میں تمھاری درخواست قبول کروں گا''، (مومن 40:60)

قرآن مجید کی اس آیت کو اس حوالے سے بیان کردہ بعض دیگر بیانات سے ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی دعا رد نہیں کرتے، لیکن اس دنیا میں ان کی عطا کا انحصار ان کے علم و مشیت پر ہے، (شوریٰ 49:49-50) ۔اللہ تعالیٰ کی مشیت ان کے علم کے تابع ہے۔ چنانچہ جب وہ جان لیتے ہیں کہ جو چیز مانگی جارہی ہے، وہ کسی بھی شر کا سبب ہوسکتی ہے تو بندے کو وہ چیز نہیں دیتے بلکہ اس سے کوئی بہتر چیز عطا کرتے ہیں۔

تاہم اس حوالے سے ایک دوسری چیز ہے جس کا تعلق قانون قدرت سے ہوتا ہے۔ سیب کا پھل پانے کے لیے سیب کا درخت لگانا ہوگا۔ آم کا درخت لگا کر سیب کی دعا مانگنے سے کبھی سیب نہیں ملے گا۔ تاہم بہت سے انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حصے کا کام بھی اللہ تعالیٰ کریں۔ یعنی انسان تو کوئی اسباب نہ کرے لیکن اللہ تعالیٰ اسباب سے بلند ہوکر ان کی دعا قبول کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا امتحان لینے کے مترادف ہے۔ یہ رویہ درست نہیں۔

اس لیے امتحان میں کامیابی کے لیے محنت کرنا ہوگی۔ ملازمت چاہیے تو اہلیت پیدا کرنا ہوگی۔ رشتہ چاہیے تو لڑکے اور لڑکی کو تمام مروجہ ضروری اسباب مہیا کرنا ہوں گے۔ ان سب کے ساتھ بھرپور کوشش اور حکمت عملی اختیار کرنا ہوگی۔ ان چیزوں کو اختیار کیے بغیر اللہ کو الزام دینا، اللہ کا امتحان لینے کے مترادف ہے۔

آل داؤد

قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالے سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جب وہ اللہ کی حمد اور تعریف کے نغمے گاتے تو پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ حمد میں مشغول ہو جاتے۔ حضرت داؤد پر نازل ہونے والی کتاب زبور اسی حمد کا مجموعہ ہے اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بڑے اعزاز سے یہ بات بیان کی ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو عطا کی تھی۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ حضرت داؤد نے اللہ کی جو حمد کی تھی وہ اللہ ہی کی عطا تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا ایک ایسا اعزاز ہے جو دنیا کی عظیم ترین نعمت ہے۔ یہ اعزاز ہر ہما شما کو نصیب نہیں ہوتا۔ جس شخص کی نگاہ مذہب اور مذہبی ادب پر ہے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ مذہب کے نام لیواؤں میں بھی اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کا اعزاز بہت کم لوگوں کو حاصل رہا ہے۔ زیادہ تر مذہبی لوگ خدا کو مان کر بھی غیر اللہ کی عظمت، اپنے اکابرین کی بڑائی اور اپنے تعصّبات میں زندہ رہے۔ اسی طرح خدا کو بھول جانے، اس کی نافرمانی کرنے اور اس کی ناشکری کرنے والے بھی اس عزت سے محروم رکھے جاتے ہیں۔

اللہ جل جلالہ کی حمد کی عزت صرف انھی کو دی جاتی ہے جو لمحہ لمحہ اس کی یاد میں گم رہتے ہیں۔ جو اس کی خاطر اپنے ہر تعصب اور ہر فرقہ وارانہ وابستگی کو قربان کر دیتے ہیں۔ جو غیب میں رہ کر بھی ہر جگہ اس کی نعمت اور احسان کو دیکھ لیتے ہیں۔ جو پیغمبروں کو اپنے قومی فخر کے بجائے اللہ کے کے نبی کے طور پر دریافت کرتے ہیں۔ جو اس کی مرضی کو اپنی قوم پرستانہ سوچ اور جذبات وخواہشات پر غالب رکھتے ہیں۔

یہی گنتی کے وہ آل داؤد ہیں جن پر خدا کا فضل ہوتا ہے اور ان کو حمد باری تعالیٰ کے لیے قبول کیا جاتا ہے۔ ان کے الہامی نغموں کے ساتھ آج بھی پہاڑ تسبیح کے گیت گاتے، پرندے حمد کے ترانے گنگناتے اور ابن آدم تکبیر بلند کرتے ہیں۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ۔ واللہ اکبر۔ وللہ الحمد۔
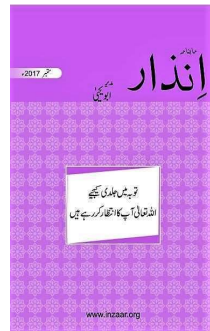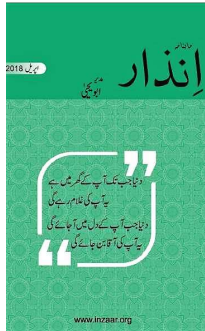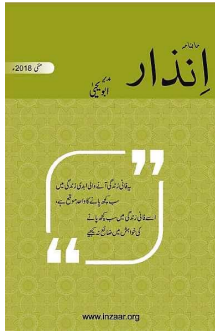
ماہنامہ انذار

مدیر: ابویحییٰ

ماہنامہ انذار ایک دعوتی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان و اخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کے لیے ان نمبروں پر رابطہ کیجیے۔

0345-8206011 or 0332-3051201